اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحم کے ساتھ

ماہنامہ

قندیلِ ادب

جنوری 2016ء

مدیر: رانا عبدالرزاق خان

07886304637 & 02089449385

rana_razzaq@hotmail.com

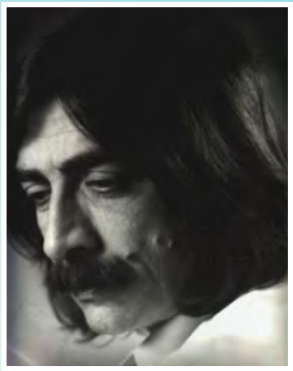

عبیداللہ علیم

کچھ دن تو بسو میری آنکھوں میں
پھر خواب اگر ہو جاؤ تو کیا

میں تنہا تھا، میں تنہا ہوں
تم آؤ تو کیا، نہ آؤ تو کیا

ہے یوں بھی زباں اور یوں بھی زباں
جی جاؤ تو کیا، مر جاؤ تو کیا

www.qindeel-e-adub.com

شمارہ نمبر: 37 جنوری 2016ء

فہرست

نامے جو میرے نام آتے ہیں	ادارہ	2
غزل۔ نیا سال ھو مبارک	امجد مرزا امجد	2
غزلیات	مبارک صدیقی، منصور خوشتر، اطہر حفیظ فراز، منور احمد کنڈے، عبد الجلیل عباد جرمنی، نجمہ شاہین لندن، عامر حسنی، مشتاق افضل کلکتہ، مرید باقر انصاری،	3-5
اسلام بچاؤ اسلام	چوہدری نعیم احمد باجوہ	6-7
استاذی المحترم چوہدری محمد علی صاحب	ڈاکٹر پرویز پروازی	8-10
ملکہ برطانیہ نے دیا ڈاکٹر افتخار احمد ایاز صاحب لندن کو SIR کا خطاب	سہیل لون	11-13
امانت	امجد مرزا امجد	14
اجالوں کی غزل کا شاعر، اے حق	اسحاق ساجد مدیر اعلیٰ ماہنامہ سمندر انٹرنیشنل جرمنی	15
اطہر نفیس	بلال افتخار	15
عمران خان	سید حسن خان	16
اُردو کا سفر	احمد مظفر	16
ماں کے آٹھ جھوٹ	ڈاکٹر مصطفیٰ اکادکی عربی نظم کے ترجمے سے اقتباس	17
جستہ جستہ	عاصی صحرائی	18
بروقت فیصلہ کرنے سے کامیابی ملتی ہے	عامر سہیل	18
شذرات۔ اخبارات و رسائل کے فکر انگیز اقتباسات	شاہد احمد چیمہ	19-21
مولانا مودودی خادمِ اسلام یا انتہا پسند؟	وسعت اللہ خان	22
اقبال و جناح اسلامی جمعیت طلبہ میں	وسعت اللہ خان	23
نثار علی کی نثاریاں	وسعت اللہ خان	24
دہشت گردی کی درس گاہیں	عاصی صحرائی	25
ایک شام مضطر عارفی کے نام	پیشکش: عاصی صحرائی	28
ڈونلڈ ٹرمپ اور مسلمان امریکی تہذیب	زکریا ورک	30

مجلس ادارت

زکریا ورک، امجد مرزا امجد، ایم اے حق بھارت، خواجہ عبدالمومن ناروے، آصف علی پرویز

نگرانِ اعلیٰ	:	خان بشیر احمد خان رفیق لندن
مدیر	:	رانا عبدالرزاق خاں
معاون مدیر	:	سید حسن خان
مدیر خصوصی	:	سہیل لون
ڈیزائنر	:	خورشید خادم
مینجنگ ڈائریکٹر	:	عاصی صحرائی
فوٹوگرافی	:	قاضی عبدالرشید، فضل عمر ڈوگر
آڈیو وڈیو	:	محمد اشرف خاکی

اراکین مشاورتی بورڈ

آدم چغتائی، منور احمد کنڈے، رضیہ اسمٰعیل برمنگھم، رند ملک کنیڈا، اسلم ناصر آسٹریلیا، اے حق یو کے ٹائمز، ثقلین مبارک آسٹریلیا، رانا مبارک احمد بحرین،، بشیر احمد خان سویڈن، راجہ منیر احمد، ڈاکٹر منصور خوشتر بھارت۔

گزارش

ہم سب اہل علم احباب کی خدمت میں گذارش کرتے ہیں کہ اپنے ادبی فن پارے، غزل، نظم، افسانہ، مشاعرے کی روئیداد وغیرہ جو بھی اِن پیج میں ارسال کیا جائے گا۔ بلا تفریق اسے معیار کے مطابق شائع کیا جائے گا۔ جو دوست بھیجتے ہیں اُن کی قدر کی جاتی ہے۔ قندیل ادب تمام ممالک جہاں اسے قائین موجود ہیں تقریباً دو لاکھ قارئین تک جاتا ہے اور ویب سائٹ سے بھی پڑھا جاتا ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ ہم نادر اور نئی تخلیقات کو اس میگزین میں جگہ دیں۔ اور ہر بھیجنے والوں کی حوصلہ افزائی کریں، اور اس میگزین کا معیار بھی عوامی کریں۔ ہر ادیب و شاعر، نقاد، افسانہ نگار، اُردو کے خدمتگار کی عزت افزائی کریں۔ ہمیں کوئی صلہ مقصود نہیں۔ اگر آپ نے کوئی کتاب لکھی ہے تو اس کا نام اور تعارف لکھ بھیجیں۔ اگر آپ کے پاس ادبی فن پارہ کوئی نہیں تو اپنے ریمارکس ہی ارسال کر دیا کریں تا کہ ہم اپنا محاسبہ کرتے رہا کریں۔ شکریہ۔

رانا عبدالرزاق خاں

وضاحت

قندیلِ اَدب انٹرنیشنل کسی سیاسی سماجی مذہبی گروہ یا فرقے کا ترجمان نہیں یہ نسل یا فرقوں کے اِمتیاز سے بالاتر ہے یہ صرف اُردو اَدب کی ترقی و ترویج کے لئے جاری کیا گیا ہے اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں قارئین کو آراء یا مضامین سے اختلاف کا حق حاصل ہے اور اس کے صفحات حاضر ہیں۔ تحریر کے ساتھ اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور ارسال کریں یہ آپ کا اپنا میگزین ہے۔

رانا عبدالرزاق خاں

نامے جو میرے نام آتے ہیں

محترم مشتاق افضل کلکتہ سے رقم طراز ہیں:

محترم رانا عبدالرزاق خان صاحب

سلام مسنون!

امید کرتا ہوں کہ مزاجِ گرامی بخیر و عافیت ہونگے۔ میں گزشتہ ہفتے سے قندیل ادب کا مطالعہ کر رہا ہوں کیونکہ میرے عزیز دوست غیاث انور شہودی نے اس آن لائن جریدے کے متعلق بتایا ویسے میں نیٹ وغیرہ سے زیادہ مانوس نہیں ہوں بس دوستوں نے میرے وجدان کو اُکسایا تو بندہ اس طرف راغب ہو گیا، غیاث انور شہودی صاحب ایک اچھے شاعر ہیں جو کہ سعودی عرب میں مقیم ہیں۔ پھر سابقہ ایک ماہ کے رسالے کا بھی مطالعہ کیا۔ متاثر ہوا، بہت میعاری رسالہ ہے۔ آپ کی گراں قدر محنت کو نہ سراہنا بے ادبی ہوگی۔ آپ واقعی داد و تحسین کے مستحق ہیں کہ لندن جیسے ہم وقت مصروف شہر سے اُردو ادب کی بہت خدمت کر رہے ہیں۔ آپ اُردو کے مردِ مجاہد ہیں، اللہ تبارک تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ وہ قندیل ادب کو دن بدن ترقی عطا فرمائے۔ اپنی دو عدد غزلیں مع تصویر ارسال خدمت ہیں امید ہے اشاعت فرما کر شکریہ کا موقع دیں گے۔

نیا سال ہو مبارک

امجد مرزا امجد

ہے دعا میری ہمیشہ تیری راحتیں سِوا ہوں
ملیں رحمتیں جہاں کی تیرے دکھ سبھی ہوا ہوں
رہے کوئی بھی شکایت نہ خدا سے کچھ گلہ ہو
کہ ہو جس کی مجھ کو خواہش وہ سب تجھے ملا ہو
سدا پھول اور کلیاں تیرے روپ کو سجائیں
تجھے دے رہا ہوں جاناں تہہ دل سے میں دعائیں
تری زندگی کا ہر دن تجھے عید کی طرح ہو
تری زندگی کی ہر شب ہو شبِ برات جیسے
نیا سال لے کے آئے تیرے گھر میں چاند تارے
دیتا ہوں میں دعائیں مبارک ہو تجھ کو پیارے
تو ملے جو مجھ کو امجؔد نہ ملے تو پھر بھی خوش ہوں
میرا کیا ہے کاٹ لوں گا تیری یاد کے سہارے

میرے پیارے خدا

نورالجمیل نجمی

میرے پیارے خدا کبھی ایسا بھی تو ہو تجھ سے جی بھر کے میں دل کی باتیں کروں
ساری دنیا سے چھپ کے پُکاروں تجھے تیری دھن میں بسر اپنی راتیں کروں
رونے والی تجھے آنکھ بھاتی ہے تو اپنی پلکوں پہ میں اپنا دل ٹانک لوں
جان اور روح کی پور پور اے خدا جس طرف تو کہے اُس طرف ہانک دوں
نام تیرا ہی اک مجھ کو کافی رہے بس یہی ورد کر کے میں سویا کروں
پیش کرنے کی خاطر تجھے اے خدا اپنے سجدوں کو اشکوں سے دھویا کروں
تری تسبیح میں ایسے دل دیا کروں کہ گھٹاؤں کا دل جھوم جانے لگے
اس قدر سوز سے نام تیرا جپوں تری رحمت کو بھی رحم آنے لگے۔
میری ہستی ہی کیا میں تیری راہ کی خاک کے خاک بننے کے قابل نہیں
کیا بتاؤں تجھے میرے اعمال میں کام کوئی بھی نیکی کا شامل نہیں
تیری رحمت کے قابل نہیں ہوں مگر تیرا در چھوڑ کر اور جاؤں کہاں
جز تیرے کل جہانوں کے واحد خدا آخر آرام جاں اور پاؤں کہاں
جب تلک جان ہے جب تلک سانس ہے میرے غفار تجھ کو بلاتا رہوں
میرے معبود میں تیرے گھر میں تیرے در پر اپنی پلکوں کے بل چل کے آتا رہوں
سرد راتوں کی خاموشیوں میں کبھی نام تیرا یہ دل گنگنانے لگے
ایسی پُر سوز وہ کیفیت ہو کہ بس سارا عالم ہی پھر جگمگانے لگے
نام میں تیرے ایسا سکوں ہے کہ بس جس کا دنیا میں کوئی بھی ثانی نہیں
جز تیرے ہم فقیروں کا کو ئی نہیں کوئی دلبر نہیں کوئی جانی نہیں
ایک پل کا پل جی نہ پائیں اگر ہم فقیروں کو تیرا سہارا نہیں
تیرے ہوتے غمگساری کرے کوئی تیرے بندے ہیں ہم کو گوارا نہیں

قندیل ادب انٹرنیشنل
کی جانب سے قارئین کو
نیا سال مبارک ہو
(مدیر)

غـــزل

غزل

مبارک صدیقی

میں سوچتا ہوں اُسے بتادوں
کہ درد حد سے گزر گیا ہے
یہ ہجر موسم عذاب بن کے
مری رگوں میں اُتر گیا ہے
بچھڑ کے اُس سے فصیلِ جاں میں
خزاں کا موسم ٹھہر گیا ہے
چلی ہیں دُکھ کی وہ آندھیاں کہ
مرے شکستہ سے آشیانے
کا تنکا تنکا بکھر گیا ہے
میں سوچتا ہوں کہ اُسے بتادوں
مگر میں اُس کو بتاؤں کیسے
وہ شخص جو تھا دُعاؤں جیسا
سُلگتے صحرا میں چھاؤں جیسا
وہ شخص جانے کدھر گیا ہے

غزل

منصور خوشتر

میرا مسلک ہے محبت دوستی شیوہ مرا
میری منزل بھی یہی ہے اور یہی رستہ مرا
کیوں کسی سے کچھ بیاں کرتا بھی میں رودادِ غم
حالِ دل کا آئینہ بھی میرے ہے، چہرا مرا
اپنی وضع داری نے ہونے دیا رسوا نہیں
گو رہا محرومیوں سے عمر بھر رشتہ مرا
آبلہ پائی سے کب صحرا نوردی رُک سکی
اک رفیقِ راہ کی صورت ہے زخمِ پا مرا
دوستوں کو ہو مبارک بھی فضائے گلستاں
راہ کب سے دیکھتا ہے دامنِ صحرا مرا
وضع داری دوستوں سے ہوسکی اتنی نہیں
دشمنوں میں رات دن تو ہوتا ہے چرچا مرا
آپ ہی نے تو محبت سے کہا تھا ایک دن
عاشقِ جاں باز ہے خوشتر فقط تنہا مرا

غزل

اطہر حفیظ فراز

دل کے شیشے پہ جونہی عکس تمہارا جائے
جیسے عیسیٰ کوئی سُولی سے گزارا جائے
دل کا انجام دلی طور پہ دل ہے جانے
پھر بھی حسرت اسی کافر کو پکارا جائے
اس کے جلووں سے بہکنے کے مناظر دیکھیں
اس کے کوچے میں فرشتوں کو اُتارا جائے
آج گلشن میں کسی چاند کو آنا ہوگا
آج گلشن کو ذرا اور سنوارا جائے
تیرے چہرے کو تپش چھوکے نہ جانے پائے
جو بھی جانا ہے مری جان!! ہمارا جائے
جس نے اک بار سنامی کی جھلک دیکھی ہے
وہ سمندر میں اکیلا نہ دوبارہ جائے
تجھ سے بچھڑوں تو مری سانس بچھڑنا چاہے
یہ جو طوفانِ مصیبت ہے خدارا جائے
اس کا اک دم سے بچھڑنا یوں قیامت کردے
جیسے بچے کی ہتھیلی سے غبارہ جائے
جیت اس شوخ حسینہ کو تبسم دے گی
دل کی خواہش ہے کہ یہ کھیل بھی ہارا جائے
اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں تناسب ہے فراز!!
دیکھیئے آج کہاں تک یہ ستارا جائے

دولفظ

اطہر حفیظ فراز

اپنے جذبوں کے دریچے کو تو وا ہونے دو !!
مجھ کو دو لفظ محبت کے عطا ہونے دو!!
تو اگر ساتھ چلے گا تو یہ صدیوں کا سفر
چند لمحوں کی مسافت پہ گزر جائے گا
تیر دل میرے تخیل سے فروزاں ہوگا
میرا دل تیری عنایت پہ گزر جائے گا
لوٹ آئیں گی تبسم کی گھٹائیں پھر سے
ہم جو دیکھیں گے وہ زہرہ سی ادائیں پھر سے
مجھ کو دو لفظ محبت کے عطا ہونے دو!!
صحنِ گلشن کے گلابوں کے ارادے دیکھو
تیرے ہونٹوں کی نزاکت میں فنا ہو جائیں گے
تیری آنکھوں کی چمک دل کو ہلا جاتی ہے
چاند تارے تیری پلکوں پہ فدا ہو جائیں
چاند بھی آج ستاروں میں خفا سا ہوگا
میرے لفظوں کی حقیقت سے شناسا ہوگا
مجھ کو دو لفظ محبت کے عطا ہونے دو!!
تیرے دیدار سے ملتا ہے برس ہا کا مزا
تجھ کو دیکھیں گے تو نہ دیکھیں گے نظارے جاناں!!
تیری بستی تیرے مسکن سے جو گزرے ہونگے
قرطبے بھولیں گے وہ بھولیں گے بخارے جاناں!!
لاکھ گلشن بھی پھلانگے، تو ہوا کہلائے
تیرے پہلو سے جو گزرے تو صبا کہلائے
مجھ کو دو لفظ محبت کے عطا ہونے دو!!
تیری مالا میں قزح رنگ سجاوٹ بھر دیں
تیری مُسکان بھی جنت کے نظاروں میں سے
تیری بندیا سے ثریا کو چمک ملتی ہے
تو وہ ہیرا ہے جو لاکھوں میں ہزاروں میں سے
تیری خوشبو سے جو ویرانے گلستاں ہونگے
تیرے جلووں سے کئی طور پریشاں ہونگے
مجھ کو دو لفظ محبت کے عطا ہونے دو!!
اک نظر غور سے دیکھو تو وضاحت ہو گی
چاند جیسا بھی ہے تاروں میں نمایاں ہوگا
آج میں سب کو محبت کی علامت دے دوں
میرا محبوب تو ساروں میں نمایاں ہوگا

تیری زُلفوں سے اُلجھوں تو گھٹائیں دیکھوں
تجھ کو پہلو میں بٹھاؤں تو ادائیں دیکھوں
مجھ کو دو لفظ محبت کے عطا ہونے دو!!
بن ترے مجھ کو تو جنت بھی ناکافی ہوگی
نہرو اثمار کی اس بات میں رکھا کیا ہے
دن کا سورج ہے تیری آنکھ کی پُتلی جاناں!!
تیرے کاجل کے سوا رات میں رکھا کیا ہے
آ میں تجھ کو بتاؤں کہ حقیقت کیا ہے
حوروں پریوں کی بھلا تجھ سے یہ نسبت کیا ہے
مجھ کو دو لفظ محبت کے عطا ہونے دو!!

منور احمد کنڈے
وطن عزیز

پرانے گھر مٹائے جا رہے ہیں
نئے نقشے بنائے جا رہے ہیں
سیاست آندھیوں کی ہو رہی ہے
سبھی دیپک بجھائے جا رہے ہیں
کہاں ہے کون ہے کہ جس کی خاطر
سبھی صدمے اُٹھائے جا رہے ہیں
جہاں پھول کھلتے تھے ہمیشہ
وہاں کانٹے اُگائے جارہے ہیں
مری بربادیوں پر میرے دُشمن
ابھی تک مسکرائے جارہے ہیں
کہیں پر قہقہوں کا جشن پیہم
کہیں آنسو بہائے جا رہے ہیں
پرانی بستیوں میں اے منورؔ
نئے فتنے اُٹھائے جا رہے ہیں

قطعہ
(خواجہ عبدالمومن ناروے)

ہر قدم پر تیری نصرت دیکھ کر
بھر گیا دل، مولا تیرے پیار سے
تیری ہستی کا گواہ مومن بھی ہے
تیری الفت کے سدا اظہار سے

غزل
عبدالجلیل عباد جرمنی

رات پڑے تو سپنوں کا وہ شہر مجھے یاد آتا ہے
آج بھی جس کا ہر اک منظر دل میرا تڑپاتا ہے
کالی چادر اوڑھے جب بھی چاند نکلتا راتوں میں
کون ہے وہ جو آنکھ کے اندر پل بھر میں آجاتا ہے
اب بھی گھنٹیاں بجتی ہیں صحرا کی ہواؤں کے اندر
اب بھی دشت کے سینے سے سسّی کا آوازہ آتا ہے
اب بھی مہینوال کوئی دریا کے کنارے بیٹھا ہے
اب بھی گھڑا کسی سوہنی کا لہروں میں غوطے کھاتا ہے
اب بھی ہیر دیوانی بن کر بھاگی چلی کوئی آتی ہے
جب بھی راتوں میں کوئی رانجھا دل کا درد جگاتا ہے
دنیا بدلی موسم بدلے پر نہ بدلہ پیار کبھی
اب بھی عشق کا دیپک لَو سے دل میں آگ لگاتا ہے

خاموش
عامر حسنی ۲۷ نومبر ۲۰۱۵ء

مسجد کے مینار گرائے ہم پھر بھی خاموش رہے
اللہ کے پھر نام مٹائے ہم پھر بھی خاموش رہے
مسجد کی اذانیں روکیں فتنہ گروں کے سائے میں
کلمہ گو مسلم جو ستائے ہم پھر بھی خاموش رہے
ظلم تصور سے بڑھ کر ، مسجد میں جاہل قاتل تھے
ناحق ہر جاخون بہائے ہم پھر بھی خاموش رہے
اللہ کے محبوب ستائے بچوں کے بھی خون کیے
احمدیوں کے مال جلائے ہم پھر بھی خاموش رہے
نام کے عالم دھبہ تو ہے نام پہ رحمت عالم کے
حملے کرکے مال لٹائے ہم پھر بھی خاموش رہے
قرآں پاک کے نام پہ ڈالے ہر ہر جان پہ ڈاکہ تُو
اس قرآں پر حرف نہ آئے سو ہم سب خاموش رہے
مہدی کے دعوے جھٹلائے اس سے بغض دکھانے پر
تیر یہاں سینوں پر کھائے ہم پھر بھی خاموش رہے
لیکن اللہ شاہد ہے گستاخ و ظالم غافل پر
جو نزدیک ہے شہ رگ سے بھی اب کیسے خاموش رہے
تیرے مقدر میں رسوائی ہے ایقان ہمارا یہ
تیر دعا ہر رات چلائے دن بھر جو خاموش رہے
تیر خدا کے جب چلتے ہیں کوئی روکے تو کیسے
شاہِ وقت کو راکھ بنائے وہ کیسے خاموش رہے
فرعونوں کا حال بھی دیکھا پھر بھی عقل سے پیدل ہو
ظالم کا انجام ہلاکت اللہ کیا خاموش رہے؟؟؟

غزل
نجمہ شاہین (لندن)

ہم نے جنونِ عشق میں صدمے اُٹھا لیے
اب تو ہماری بات خدرا نہ ٹالیے
جاں کا زیاں ہو قربِ رفیق و ندیم سے
اِس طرح آستین میں مت سانپ پالیے
دامن کو آپ کے بھی غلاظت کرے کثیف
ہر شخص پر نہ اِس طرح کیچڑ اُچھالیے
گلشن میں آپ یوں بھی تو آئے ہیں سیر کو
کانٹے بھی شاخِ گل پہ ہیں دامن سنبھالیے
نجمہؔ نوید لائی جو اُمید کی کِرن
ہم نے نظر میں کتنے ہی منظر سجا لیے

غزل
عامر حسنی ۲۷ نومبر ۲۰۱۵ء

”کون کہتا ہے محبت کی زباں ہوتی ہے“
یہ محبت تو اداؤں کی کماں ہوتی ہے
جس کی چاہت کہیں پنہاں رہی تیرے دل میں
اسکی ہر ایک ادا شعلہ بیاں ہوتی ہے
دل سے دل جوڑ رکھوں روح کے اندر اتروں
دل کی ایک ایک نگہ جس پہ عیاں ہوتی ہے
دل کی آنکھوں سے جسے دیکھتا آیا ہر دم
قربِ قامت دمِ عاشق پہ گماں ہوتی ہے
گل کی رنگینی تبسم بھی ہے شیرینی بھی
لب جو کھولے تو حلاوت ہی نہاں ہوتی ہے
جس کو پانے کو میں لٹتا ہوا مرتا آیا
اس کی آمد پہ نہیں منہ میں زباں ہوتی ہے
پھول جھڑتے ہیں زباں سے جو کبھی ہو گویا
اس کے انفاس میں اک روح رواں ہوتی ہے
جس کے تاروں بھرے مسکن کو جلانا چاہو
کون جانے اسی آنگن میں اماں ہوتی ہے
عامرؔ ایک ایک ادا مجھ کو کرے ہے گھائل
حشر ساماں کی جگہ دل میں یہاں ہوتی ہے

غزل
نجمہ شاہین (لندن)

ہوش و حواس چھین لئے دل دُکھا دیا
مری وفا کا آپ نے اچھا صِلہ دیا
دشواریوں کو کس قدر آساں بنا دیا
اُس نے ہمارا حال سنا، مُسکرا دیا
محبوب نے کلام کا فن بھی سکھا دیا
دِل کی کسک نے ہم کو بھی شاعر بنا دیا
خود دیکھ لو جو زخم ہمارے جگر میں ہیں
ہم آپ کو کیا بتائیں کہ دنیا نے کیا دیا
رنج و الم سے کر کے دِل و جاں کو بے نیاز
اُس نے مجھے قتیلِ تبسّم بنا دیا
مرمر کے ہم نے عشق میں پائی ہے زندگی
ہم کو اجل کے وار نے جینا سکھا دیا
آیا وہ سامنے تو اُٹھا کر سبھی حجاب
نظروں نے اُس کو حالِ دل و جاں سُنا دیا
نجمہؔ اُسی کا نام ہے طوفانِ زندگی
جینے کا روز جس نے نیا حوصلہ دیا

غزل
مشتاق افضل کلکتہ

زمیں فکرو فن باندھے ہوئے ہیں
غزل میں ہم گگن باندھے ہوئے ہیں
معطر کیوں نہ ہو کردار اپنا
خیالوں میں چمن باندھے ہوئے ہیں
ہمارا کیا بگاڑے گا زمانہ
دعاؤں سے بدن باندھے ہوئے ہیں
تلاشِ زندگی کب ختم ہوگی
کہ کب سے ہم تھکن باندھے ہوئے ہیں
ہمیں تم موت کی دھمکی نہ دینا
کہ سر سے ہم کفن باندھے ہوئے ہیں
ہواؤں میں کیسے بکھرتی خوشبو
وہ زلفوں میں ربن باندھے ہوئے ہیں
مرے اشعار ہیں کمزور افضلؔ
مگر دستارِ فن باندھے ہوئے ہیں

غزل
مشتاق افضل کلکتہ

گلوں کے جسم پہ شمشیر دیکھنے کے لئے
چلو گے! وادی کشمیر دیکھنے کے لئے
کہاں کہاں سے نہ گزرا ہجوم و فکرو نظر
مرے بزرگوں کی تو قیر دیکھنے کے لئے
عجیب لوگ ہیں ٹھہرے ہیں راہ میں کب سے
ہمارے پاؤں میں زنجیر دیکھنے کے لئے
مہ و نجوم کی دنیا پہ رکھ رہا ہوں قدم
بہت قریب سے تنویر دیکھنے کے لئے
ہمارے پاس ہے قرآن آئینے کی طرح
ہر ایک جرم کی تعزیر دیکھنے کے لئے
اُمنڈ آئی ہے تہذیب شہر کی افضلؔ
ہمارے گاؤں کی تصویر دیکھنے کے لئے

آہ مظفر عارفی مرحوم
عبدالجلیل عباد جرمنی

سخن کی دنیا کا روشن وہ چاند تارہ تھا
سخن طراز وہ، آئینہ رُو ہمارا تھا
اُسے بھی عشق تھا ربّ کی حسیں خلافت سے
مرے حضور کے دل کا بھی وہ دُلارا تھا
وہ فلسفی تھا وہ درویش اور خدا والا
ہر ایک لفظ میں اُسکے عجب اشارا تھا
سُنا ہے اُس میں دریا رواں تھا جذبوں کا
وہ پیار خوشبو عبادت کا استعارہ تھا
وہ دستِ شب پہ چلاتا تھا اشکوں کے چراغ
تھا درد مند دعا کے بنا نہ چارہ تھا
سُنا ہے آدمی خوددار و غم شناس بھی تھا
اک آن بان تھی دُکھیوں کا بھی سہارا تھا
نکالتا تھا وہ گوہر خیال ساگر سے
سُنا ہے علم و عمل کا بھی وہ منارہ تھا
وہ دل کے ساز پہ گاتا تھا سرمدی نغمے
وہ خواب دیدہ ستاروں پہ اک شرارا تھا
وہ دلربائی بھی کرتا تھا حق شناسی سے
صلیبِ عشق سے شعروں کو بھی سنوارا تھا
بنا کے سخن کو تلوار پھرتا رہتا تھا
یہ بانکپن تو عدو پر بھی آشکارا تھا
وہ منفرد تھا اور قادرالکلام تھا وہ
وہ دلکشی و کرامت کا شاہ پارہ تھا
نگارِ دیں کا عاشق وہ پکا سچا تھا
جو کچھ بھی پاس تھا قدموں میں لا اُتارا تھا
گیا تو شہر کی رونق ہی لے گیا وہ ساتھ
حسین شخص تھا سب کو بہت پیارا تھا
وہ پیچھے چھوڑ گیا اپنے آنسوؤں کے چراغ
یہاں اندھیرا ہو اُسکو کہاں گوارا تھا

غزل
مرید باقر انصاری

جو بھری بزم میں اوروں سے جدا لگتا ہے
اچھا لگتا ہے مگر اہل وفا لگتا ہے
اُس کی ہو جائے فقیروں پہ اگر نظر کرم
موسم دل کا ہر ایک پیڑ ہرا لگتا ہے
کیسے دے گا تو زمانے کے سوالوں کے جواب
تو کبھی سوچ اے دل تیرا وہ کیا لگتا ہے
کوئی بھائے نہ تجھے تو ہے تیری آنکھ میں نقص
آنکھ بہتر ہو تو سب کچھ ہی بھلا لگتا ہے
کوئی کیونکر میری کٹیا کو جلائے گا بھلا
مجھے دُشمن اپنا ہی دیا لگتا ہے
اس زمانے میں محبت بھی گناہ ہے شاید
یہ جو سارا ہی جہاں مجھ سے خفا لگتا ہے
کیسے کرتے ہیں وہ مجنوں کا شکوہ باقر
میں تو اک لفظ بھی بولوں تو بُرا لگتا ہے

❁❁❁

اسلام بچاؤ اسلام

(چوہدری نعیم احمد باجوہ)

میں جب بھی تصور تصور میں مسجد نبوی ﷺ میں نجران کے عیسائیوں کا وفد بیٹھے ہوئے دیکھتا ہوں تو روح وجد میں آجاتی ہے۔ مذہبی رواداری کے امین اور امن کے سفیر ﷺ کے لئے درود اور سلام کے دھارے بہہ نکلتے ہیں۔ آپ بھی میرے ساتھ اس منظر کو دیکھئے؛ عیسائی عالموں، پادریوں کا جبہ دار وفد گلے میں صلیبیں لٹکائے، اپنے روایتی مجسموں، رسم، و رواج لوازمات اور طور طریقوں کے ساتھ حاضر خدمت ہوتا ہے۔ رحمت للعالمین ﷺ (فداہ اَبی واُمی) اس وفد کا استقبال اپنی روایات اور شان شوکت کے ساتھ کرتے ہیں۔ ایسا استقبال کے مذہبی دنیا میں ایک مثال قائم کر دیتے ہیں۔ مذہبی رواداری، وسیع حوصلے اور اخلاق عالیہ کا قلعہ تعمیر کر دیتے ہیں۔ اس وفد کو مسجد نبوی میں ملاقات کا وقت عنایت ہوتا ہے۔ مسجد نبوی ہے اور عیسائیوں کا وفد۔ گفتگو کا دور چلتا ہے، تعلیمات، عقائد پر بات ہوتی ہے۔، وفد اخلاق عالیہ سے متاثر ہوتا ہے۔ پھر کچھ دیر بعد ان کی عبادت کا وقت ہو جاتا ہے۔ عیسائیوں کی عبادت کا حال معلوم کرنے کے لئے آپ آج دنیا کے کسی گرجا گھر کا چکر لگالیں۔ وفد نے خیال کیا کہ ہم تو کسی اور مذہب والے کو اپنے گرجا گھر میں عبادت کی اجازت نہیں دیتے۔ ہمیں بھی تو باہر جا کر عبادت کرنی ہوگی۔

یہ تو مسجد ہے اور مسلمانوں کی عبادت گاہ ہے۔ چنانچہ عرض کیا یا حضرت ہماری عبادت کا وقت ہو گیا ہے۔ عبادت کرنے کے لئے باہر جانے کی اجازت چاہتے ہیں۔ دوبارہ حاضر خدمت ہوتے ہیں۔ فرمایا جہاں ہم اس وقت بیٹھے ہیں یہ بھی تو عبادت گاہ ہے۔ یہ اللہ کا گھر ہے تمہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ وفد کے ارکان حیران و پریشان ایک دوسرے کا منہ دیکھتے ہیں۔ لیکن پھر رحمت اللعالمین کی طرف سے دوبارہ اثبات کا اشارہ پا کر مسجد نبوی میں عیسائی طریق کے مطابق عبادت کرتے ہیں۔ آج ان کی عبادات کی کیفیت شکر گزاری کے اور پہلو لئے ہوئے ہے۔ کیونکہ عبادت تو ہے ہی شکر گزاری اور جب شکر گزاری کے بیرونی محرکات بھی ہوں تو عبادت کا سرُور بڑھ جاتا ہے حمد و ثنا کے الفاظ تصویر بننے لگ جاتے ہیں۔ عبادت میں مزہ آنے لگ جاتا ہے۔ وفد آپ کے اخلاق عالیہ سے بہت متاثر تھا۔ اب عملی نمونہ دیکھ کر گرویدہ کیا دل و جان سے فدا ہو گیا۔ یہ تھا ہمارے آقا سید و مولیٰ ولد آدم ﷺ کا دوسروں کے عقیدہ، مذہب اور روایات کا احترام۔

آپ نے صرف زبانی تعلیمات تک اس کو محدود نہیں رہنے دیا بلکہ علمی نمونہ پیش کر کے تا قیامت اپنی اُمت اور ساری دنیا کو دوسرے کے عقیدے اور مذہب کے احترام کا سبق دیا آپ نے بتایا کہ اسلام کس قدر اعلیٰ اقدار اور وسیع حوصلہ مذہب ہے اور آپ کا لایا ہوا دین اسلام اپنی معنوں کے اندر امن و آشتی، صلح و رواداری کو سمیٹے ہوئے ہے۔ ہادی برحق مذہبی رواداری کے سب سے بڑے چیمپئن اور سب سے بڑے لیڈر تھے۔ آج تک ہیں اور قیامت تک رہیں گے۔ کیونکہ آپ سے بڑھ کر کسی اور میں کب یہ طاقت، یہ ہمت اور یہ اسلوب نہ تھا کہ عظیم الشان مذہبی رواداری کی عمارت تعمیر کر جاتا۔ آپ نے نہ صرف امن و محبت کے اصول سکھائے بلکہ ان خداداد اصولوں پر بنیاد رکھ کر امن سلامتی و رواداری کی روایت قائم کر کے معاشرے کو امن کا گہوارہ بنا دیا۔ آج ہم آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب ہونے والے، آپ ﷺ پر درود بھیجنے والے،، گلا پھاڑ پھاڑ کر ''حُبِ رسول کا دعویٰ کرنے والے، کس رواداری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ کس کے عقیدے کا احترام کر رہے ہیں، سلامتی کا کون سا پیغام دنیا کو دے رہے ہیں۔ ہم تو کلمہ گو کو اگر وہ ہمارے نظریات سے اتفاق نہیں رکھتا اپنی مسجد میں گھسنے نہیں دیتے۔ کب کسی عیسائی یا دوسرے مذہب والے کے ساتھ بیٹھ کر محبت کا ظہار کریں گے۔ اگر کبھی کرتے ہیں تو منافقت کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہم دوسرے مذاہب والوں کو اپنی مسجد میں عبادت کی اجازت دیں؟؟ نہیں نہیں ہم تو ان کی عبادت گاہیں قائم بھی نہیں رہنے دیں گے۔

ہم نے تو ''اسلام'' نافذ کرنا ہے۔ اپنے اوپر نہیں دوسروں کے اوپر کرنا ہے۔ ہم نے مسلمانوں کی تعداد کو بڑھانا ہے لیکن تبلیغ و تربیت اور عملی نمونے سے نہیں یہ تو بہت مشکل کام ہے۔ کون مغز ماری کرے ان کافروں کے ساتھ؟ کون امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا پھرے۔ ہمارے پاس وقت کہاں۔ ابھی تو چھ ارب آبادی غیر مسلم ہے سب پر اسلام نافذ کرنا ہے۔ ناپاک کافر ہمارے سامنے حیثیت کیا رکھتا ہے یہ تو ہمارے عالم دین کے ایک ''اعلان جہاد'' کی مار ہے۔ چلو مولوی صاحب اُٹھو مسجد میں ''اعلانِ جہاد'' کرو باقی کام ہم کود کر لیں گے۔ آپ اعلان کرو پھر دیکھو'' عاشقان رسول'' کس سج دھج سے ''حب رسول'' سے سرشار باہر آتے ہیں وہ تو اشارے کے ہی منتظر ہیں۔ ان ''کافروں'' کو کس نے حق دیا کہ وہ ہمارے مسلم معاشرے میں رہ سکیں۔ یہاں بزنس کریں۔ فیکٹریاں لگائیں۔

علاقے کے لوگوں کی خدمت کریں۔ نہیں نہیں یہ تو بہت بڑے مجرم ہیں۔ ان کے جرموں کی فہرست بڑی طویل ہے۔ مجاہدو! سب اپنے ہتھیار لے اؤ۔ ایمان تازہ کرو جہاد کی صدا آئی ہے۔ لاٹھیاں ڈنڈے چاقو چھریاں سب لے آؤ دیکھو پیٹرول لانا نہ بھول جانا۔ آگ بھی تو لگانا ہے۔ واہ آج میرے وطن میں جہاد کرنا کتنا آسان کر دیا مولوی نے۔ پیشگی تیاری کی ضرورت نہ زیادہ ساز و سامان کی۔ بس ایک اعلان ہوا اور ''مجاہدین'' نکل پڑے۔ صدا آتی ہے جلدی کرو'' بیس سے اکیس منٹ'' نہ ہونے پائیں سب کو منظور؟ منظور منظور۔ مجمع پر جوش۔ بس اپنے لیڈروں کے اشارے کے منتظر۔ صدقے یا رسول اللہ کیسا عمدہ ''جہاد'' کا ہے کوئی بچ کے جانے نہ پائے۔ ڈالو

پیٹرول لگاؤ آگ۔نہیں ٹھہرو ابھی ''حُبِ رُسول'' کا نعرہ تو ابھی لگایا نہیں۔'' غلامی رسول میں موت بھی قبول ہے''اس لئے بانٹو موت۔کیونکہ ہمیں غلامی رسول میں موت بانٹنا قبول ہے۔اپنے نفس پر موت وارد کرنا ہمارا کام تھوڑے ہی ہے۔اللہ اکبر۔آگ لگ گئی آشیانے جل رہے ہیں۔کسی کی ساری عمر کی پونجی لٹ گئی۔معصوموں کی چیخ وپکار آسمان کو چھو رہی ہے۔ پر'' عاشقان رسول'' کا نعرہ کا کوئی جواب نہیں۔ یہ آہیں یہ سسکیاں ان نعروں کے آگے کیا حیثیت رکھتی ہیں۔گذشتہ سال حرا کی حریت لٹ گئی۔ کائنات کی کل کائنات راکھ ہوگئی۔شہزاد کی زندگی کا چراغ گل کر دیا گیا۔اور اس کی شمع جلا کر ہمیشہ کے لئے ٹھنڈی کر دی گئی پر'' عاشقان رُسول'' کو قرار نہ آیا۔انہیں لہو گرم کرنے کا کوئی اور بہانہ درکار ہے۔کوئی اور'' میدان جہاد'' تیار ہونا چاہیے۔چلو پھر نصف صدی کی محنت سے کھڑی کی گئی چپ بورڈ فیکٹری کس کام آئے گی؟ علاقے کے غریبوں کا پالنے والی یہ فیکٹری یہاں کیوں قائم ہے؟ پھر دیکھتے ہی دیکھتے مجاہدین کا جذبہ شوق کے آگے سالوں کی محنت منٹوں میں راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ایک مشن مکمل ہوا۔صبح کام پر گئے تھے،کل پھر جانا تھا ابھی رات کو جہاد کرلو۔واہ کیا شان ہے اس'' مومن'' کی چلو'' مجاہدو'' اب باقی ماندہ رات آرام کرو۔صبح نیا شغل ہوگا۔دوسرے مرحلہ ابھی باقی ہے۔وہ کل طے کریں گے۔مجاہدین نے رات آرام کیا صبح ہوتے ہی جذبہ جہاد پھر جاگا اور قلعہ سر کرنا باقی تھا۔قریب ہی احمدیوں کی'' عبات گاہ'' کیوں قائم ہے؟ جب سرعام جی ٹی روڈ فیکٹری جلا دی کسی نہیں روکا۔تو پھر اس'' عبادت گاہ'' کو جلانے سے روکنے کون آئے گا؟ یہ تو چند منٹوں کی مار ہے چلو چلو سب چلو۔ایمان تازہ کریں آج علاقے بھر میں'' ایمان اور اسلام'' قائم ہو کر ہی رہے گا۔آج دوسروں پر اسلام'' نافذ'' کرنا ہی ہوگا۔قانون نافذ کرنے والے اور ادارے بھی آگئے۔میرے وطن کے رکھوالے بھی موجود ہیں پر وہ کیوں روکیں گے؟ کیا اُنکو ثواب کی ضرورت نہیں؟

DPO کافر تو مرنا نہیں چاہتا۔وہ بھی تو شامل جہاد ہو کر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا رکر رہا ہے۔ یہاں تو مفت میں ثواب بنٹ رہا ہے۔مفت میں ملے تو قاضی شہر بھی پی لے۔واہ کیسی کیسی فتوحات اہل جہلم کے حصہ میں آئی ہیں آج۔فیکٹری جل گئی،مسجد، نہیں نہیں'' عبادت گاہ'' جلا دی گئی اور فتح ہوئی۔'' اسلام'' بچ گیا۔ہاں ان کا'' اسلام'' بچ گیا پر انسانیت تڑپ تڑپ کر اور سسک سسک کر مر گئی۔عوام کالانعام ہی ٹھہرے پر ان'' بڑوں'' کی عقل کا ماتم کون کرے اور کیسے کرے؟ جن کو بنگلہ دیش میں پھانسیوں پر بہت دُکھ اور تکلیف ہے۔ بلکہ ساری دنیا میں ٹھیکیداری اُن کی سپرد ہے۔ جہلم تو ان کی ناک کے نیچے ہے وہ کیوں نظر نہیں آیا؟ وہ نظر آتا بھی کیوں وہاں لٹنے والے انسان تھوڑی تھے۔وہاں کوئی مسئلہ تھوڑی تھا وہاں تو'' جہاد'' ہو رہا تھا۔کہتے ہیں ایکشن لے لیا۔کوئی تو مجھے بتائے ایکشن لینا کیا ہوتا ہے۔واہ واہ کیا ایکشن لیا اگلے روز کی کاروائی فوج اور پولیس کی نگرانی میں ہوئی۔ایکشن اس سے تیز تر ایکشن کبھی دیکھا آپ نے؟ سارا دن مساجد میں اعلانات ہوتے رہے کسی کو خبر نہیں۔کسی کو ایکشن لینا یاد نہ رہا۔سب سے پہلے'' بریک'' کرنے کا دعویٰ کرنیوالے نیوز چینل نے خبر کو تو بریک نہیں ہونے دیا تاہم سب مل کر فیکٹری،مسجد گھروں کا ساز وسامان'' بریک'' ہوتا ضرور دیکھتے رہے۔بریکنگ نیوز یہ تھوڑی ہے کہ احمدی کی فیکٹری جلا دی گئی بریکنگ نیوز تو یہ ہے کہ جی ٹی روڈ بند ہوگئی۔!!!

مجھے تو احمدیوں کے ترجمان کی بات میں وزن اور صداقت معلوم ہوتی ہے کہ جنہوں نے انٹرویو پر ایک سوال پر کہا کہ پولیس ان ہنگاموں پر کنٹرول نہیں کر پا رہی؟ کہا'' کنٹرول نہیں کر پا رہی یا کرنا نہیں چاہتی'' اگلے روز'' کنٹرول کرنا نہیں چاہتی'' کا منظر ساری دنیا نے دیکھا کہ قانون کے محافظوں کی گود میں بیٹھ کر کیسے شرانگیزی کی گئی۔ مسجد کا سامان جلایا۔قبضہ کیا نام بدلا۔اللہ بھی خوش بندے بھی خوش۔قبضہ مافیا بھی خوش۔پراپرٹی بھی ہاتھ آگئی۔دیکھئے'' جہاد'' کے ثمرات!!!۔مسجد'' اللہ والی'' ہوگئی۔ واہ کیا عمدہ طریقہ ہے۔مال لوٹو قبضہ کرو پھر اللہ کے ساتھ منسوب کر کے قبضہ بنالو۔میر ی نظری سارے اخبارات میں'' خادموں'' اور'' حاکموں'' کے بیانات کو ڈھونڈتی رہیں کہ کسی نے تو کوئی مذمتی بیان دیا ہوگا۔کسی نے تو کوئی ہمدری کا لفظ ان لٹنے والوں کے حق میں کہا ہوگا۔کسی نے تو کوئی بیان فیکٹری کوری سیٹ کرنیکے حق میں دیا ہوگا۔ پر بے سود انسانیت مرگئی تو پھر انسان کیوں حق میں بیان دینے لگے؟ وہ سب تو'' اسلامی'' تھا۔ '' کافروں'' سے ہمدردی کیسی؟ کون سا بیان؟ کون سی مذمت؟ احمدی تو'' کافر'' تھے ان کا مال لوٹنا جائز اور'' مال غنیمت'' ٹھہرا۔ پر وہ بیسویوں غریب مزدور جن کے ہاتھوں میں حکومت وقت کی عطا کردہ'' سند مسلمانی'' بھی موجود ہے جن کے چولہے نومبر کی اس سردی میں اور سرد کر دئے گئے۔سردیوں کے ان دنوں میں مزدور اور ان کے بچے کانپتے ہاتھوں،نیلے پڑے ہونٹوں،ننگے بدن اور خالی پیٹوں کس'' خادم'' کس'' حاکم'' کے دولت کدے پر حاضر ہوں۔انصاف کے لئے کس منصف اعلیٰ کے در کی زنجیر ہلائیں۔ہے کوئی ان کے پرسہ دینے والا؟؟ کہیں غریب کے چولہے کی آگ،اس کے خالی پیٹ کی آہوں کی آگ،فیکٹری کو جلانے کے لئے جلانے والی آگ اکٹھی ہو کر سب'' خادموں'' سب'' حاکموں'' اور'' مجاہدوں'' کو بھسم کرنے نہ آجائے۔ڈرنا اس دن سے چاہیے کہ جب یہ آگ اتنی بلند نہ ہو جائے کہ آسمان تک جا پہنچے۔اور آسمان سے واپس برسنا شروع کر دے۔جب آگ آسمان سے برستی ہے تو پھر کوئی محل،کوئی بنکر،کوئی سیکورٹی نہیں بچا سکتی،کوئی جھوٹے بیان اور طفل تسلیاں کام نہیں آتیں۔اس وقت نیشنل ایکشن پلان کا چورن بھی شفا نہیں دے سکے گا۔جب نہیں بولتا بندہ تو خدا بولتا ہے۔ڈرائے کوئی میرے اہل وطن کو آسمان کی لعنت سے کہ'' وہ جس پر پڑتی ہے دونوں جہانوں میں اس کی بیخ کنی کر جاتی ہے۔''

استاذی المحترم چوہدری محمد علی صاحب

مکرم ڈاکٹر پرویز پروازی صاحب

حیف کہ ایک صدی تک ''اشکوں کے چراغ'' جلانے والا بجھ گیا۔ایک شمع تھی دلیل سحر سوخموش ہے۔تعلیم الاسلام کالج کی ایک صدی کی تاریخ چوہدری محمد علی صاحب کے ساتھ دفن ہوگئی۔افسوس ازقبیلہ مجنوں کسے نہ ماند!استاذی المحترم چوہدری محمد علی کو یاد کرنے بیٹھا ہوں تو کئی لفظ اور فقرے ذہن میں آئے ہیں مگر کوئی بھی میرے اصل جذبات کا ترجمان نہیں بن سکا۔ان کی ذات اظہار کی ان تمام صورتوں سے کہیں بلند تھی۔وہ استاد تھے مگر استادوں جیسے نہیں تھے شاعر تھے مگر خود کو شاعر نہیں کہتے یا سمجھتے تھے کھیل کے میدان میں بھی انہیں یکساں مقبولیت حاصل تھی مگر کھلاڑی نہیں تھے۔وہ صرف احمدی تھے اور خلافت کے شیدائی اور بس!چوہدری صاحب نے جوانی کے اس زمانہ میں احمدیت قبول کی جسے جوانی دیوانی کا نام دیا جاتا ہے اور دیوانوں کی طرح احمدیت سے وابستہ ہوئے اور آخر دم تک وابستہ رہے۔

میرا ان سے پہلا پہلا تعارف کالج میں داخل ہونے کے بعد ہوا۔کالج میں داخلہ کے ساتھ ہی مجھے پرنسپل صاحب نے المنار کے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل کر دیا۔میں نے پرنسپل صاحب کی ایک محفل میں چوہدری صاحب کی ایک غزل سنی اپنی یادداشت کے زور پر اسے کاغذ پر اتارا اور المنار کے اگلے شمارہ میں اسے شائع کر دیا۔ المنار چھپ کر آیا تو کالج میں ایک طوفان برپا ہوگیا۔معلوم ہوا چوہدری صاحب میری اس حرکت پر سخت نالاں ہیں۔حتیٰ کہ میں کسی کام سے پرنسپل صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو پرنسپل صاحب نے مسکرا کر فرمایا''خیر مناؤ۔چوہدری صاحب ناراض ہیں۔''ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ چوہدری صاحب پرنسپل کے کمرہ میں داخل ہوئے دیکھا کہ حضرت پرنسپل صاحب میرے ساتھ محبت سے مسکرا کر بات کر رہے ہیں تو ان کا سارا غصہ کافور ہوگیا۔پرنسپل صاحب نے ہنس کر فرمایا''لیجئے آپ کا ملزم حاضر ہے۔''چوہدری صاحب کی آنکھوں سے جھڑی لگ گئی ہمیں کیا کہتے سنتے۔ہم حق دق حیران کھڑے کبھی انہیں دیکھتے کبھی پرنسپل صاحب کی جانب نگاہ اٹھاتے۔آخر چوہدری صاحب نے صرف اتنا فرمایا آئندہ میری کوئی چیز المنار میں شائع نہ کریں اور ہمیں اجازت مل گئی اور چوہدری صاحب کی طرف سے معافی بھی۔چوہدری صاحب کی طبیعت میں رقت بہت تھی حساس بھی بہت تھے۔طالب علموں کی تکلیف ان سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔کوئی طالب علم دلگیر لہجہ میں بات کرتا تو اس کے ساتھ رونے لگتے۔پرنسپل کا نام لیتے تو رقت سے لیتے اور جب حضور خلافت پر فائز ہوگئے تو جب بھی حضور کا نام زبان پر آتا تو آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔یہی حال خلیفہ ثانی اور خلیفہ رابع کے ذکر کا تھا۔ادھر نام زبان پر آیا ادھر آواز میں رقت اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔(یہ تو ان کی وفات کے بعد پتہ چلا کہ پہلے پہل احمدیت سے مولانا ظہور حسین صاحب بخارا کے ذریعہ متعارف ہوئے تھے۔مولانا کا یہی رنگ تھا رقت ان کی بھی باتوں کی جزو عظیم تھی۔)

اس پہلے معرکہ کے بعد ہمارے ساتھ انتہائی محبت اور مہربانی کا سلوک فرمانے لگے۔کبھی کبھی اپنا کلام بھی سناتے۔ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ سناتے سناتے رُک کر ہمیں پوچھا کیوں بھئی یہ مصرعہ ٹھیک ہے نا؟ایک ادنیٰ طالب علم کے ساتھ ایسا سلوک وہی روا رکھ سکتا ہے۔جو وسیع القلب اور حوصلہ مند ہو۔مدت العمر ہمارے ساتھ محبت کا سلوک روا رکھا۔مدتوں بعد لندن میں ملاقات ہوئی تو گلے لگا کر بہت روئے فرمایا حضرت اقدس خلیفۃ المسیح کا ارشاد ہے۔شعر لوگوں کو سنایا کرو اب ربوہ میں کوئی ایسا نہیں ملتا جسے شعر سنانے کو جی چاہے۔یہ ان کی محبت تھی ورنہ ربوہ تو اہل ذوق کا ہرا بھرا چمن تھا۔دراصل شعر سنانا ان کی طبیعت کے خلاف تھا۔حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی محبت میں محفلوں میں شعر سنانے لگے تھے۔مگر چھپوانے پر راضی نہیں ہوتے تھے۔حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ نے اصرار کر کے ان کا مجموعہ مرتب کروایا اور چھپوایا۔میں نے اس پر تبصرہ لکھا تو ان کی کتاب کو اکیسویں صدی کی غزلات الغزلات قرار دیا۔حضرت اقدس خلیفہ الخامس کا فون پر پیغام آیا کہ''اگر آپ اجازت دیں تو آپ کے تبصرہ کو قادیان سے چھپنے والے ایڈیشن پر بطور دیباچہ شائع کر دیا جائے۔''

میں نے کہاں زہے نصیب کہ حضرت اقدس اپنے ایک ادنیٰ غلام سے یہ بات کہہ رہے ہیں اور بہ نفس نفیس چوہدری صاحب کے کلام کے دیباچہ کی طرف اتنی توجہ دے رہے ہیں۔حقیقت یہی ہے کہ چوہدری صاحب کے کلام میں اتنی بلاغت و لطافت تھی کہ سننے والا دنگ رہ جاتا تھا۔کالج کے سٹاف کے سینئر اساتذہ میاں عطاء الرحمٰن،صوفی بشارت الرحمٰن،چوہدری محمد علی،محبوب عالم خالد،ڈاکٹر سلطان محمود شاہد،پروفیسر حبیب اللہ خاں اور ڈاکٹر نصیر احمد خاں سب کے سب پرنسپل مرزا ناصر احمد کے عاشق تھے۔ کالج کی سٹاف میٹنگز میں ان لوگوں کا رکھ رکھاؤ ایسا تھا۔گویا کسی پرنسپل سے نہیں کسی محبوب سے باتیں کر رہے ہیں۔ادھر پرنسپل کی طرف سے کوئی حکم موصول ہوتا ادھر سب اس کی تعمیل میں سرگرم ہو جاتے۔چوہدری محمد علی اس محبت میں بھی نمایاں تر تھے۔انہیں تو کالج کے علاوہ ہاسٹل کا انتظام بھی کرنا ہوتا تھا پرنسپل کی طرف سے کوئی حکم آ جاتا تو سب کام چھوڑ چھاڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتے۔بہ نظر ظاہر چوہدری صاحب کو گل محمد کہا جاتا تھا۔یعنی''حضرت شیخ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے''ہاسٹل کیا یک کمرہ میں رہتے تھے تو اس کمرہ سے شاذ ہی باہر نکلتے تھے بعد کو سپرنٹنڈنٹ کی کوٹھی میں منتقل ہوگئے۔وہیں بیٹھے بیٹھے ہاسٹل کے سارے کام چلاتے تھے۔مگر پرنسپل صاحب نے انہیں روئنگ کا نگران بنایا تو سردی ہو یا گرمی بارش ہو یا آندھی چوہدری صاحب علی الصبح دریا پر موجود ہوتے لاہور میں راوی پر اور ربوہ میں چناب پر۔ پروفیسر

نصیر احمد خاں کے اعلیٰ تعلیم کیلئے انگلستان جانے کے بعد باسکٹ بال ان کی نگرانی میں آیا۔ ماسٹر فضل داد صاحب تو کھلاڑیوں کو ورزش کروانے کو گراؤنڈ میں موجود رہتے ہی تھے چوہدری صاحب بھی حاضر رہتے۔ یہ کرشمہ پرنسپل کی کامل اطاعت کا تھا کہ پرنسپل کو یہ شکایت نہ ہو کہ کھیل کا نگران کھیل کی نگرانی سے غافل ہے۔ ہاسٹل میں رہنے والے بعض طلباء کو شکایت رہتی تھی کہ چوہدری صاحب کم آمیز ہیں اور ہاسٹل کے نگران کو ایک حد تک کم آمیز ہونا بھی چاہئے مگر کھلاڑیوں کو کبھی کم آمیزی کی شکایت نہیں ہوئی۔ ہر وقت ہر ضرورت کے وقت انہیں موجود پایا گیا۔

باسکٹ بال کے بعض ایسے کھلاڑی تھے جن کے پاس پہننے کو مناسب کپڑے اور جوتے بھی نہیں ہوتے تھے مگر چوہدری صاحب نے کسی کھلاڑی کو دوسرے کھلاڑیوں کے مقابلہ میں احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہونے دیا وہ یہ سب کچھ اتنی خاموشی اور وقار سے کرتے تھے کہ کسی کو کان کان خبر نہ ہوتی تھی۔ پرنسپل بن جانے کے بعد تو ان کی شخصیت بالکل ہی بدل گئی۔ پہلے روز پرنسپل کی کرسی پر بیٹھے تو رو رو کر برا حال کر لیا کہ میں اس کرسی پر کیسے بیٹھوں جس پر حضرت مرزا ناصر احمد اور قاضی محمد اسلم جیسے لوگ بیٹھا کرتے تھے۔ کالج کونسل کا پہلا اجلاس بھی یادگار رہا۔ کونسل کے سب اراکین ان کے پرانے رفقاء تھے اور سینئر، صرف ایک ہم تھے جو نئے پروفیسر کے عہدے پر ترقی پا کر کالج کونسل میں شامل ہوئے تھے۔ چوہدری صاحب نے اجلاس شروع ہوتے ہی کہا کونسل کا اجلاس شروع ہوتا تھا تو پرنسپل صاحب.....اور بس! آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ ایجنڈہ دھرا رہ گیا۔ کوئی کیا کہتا۔ بس اس پر کونسل کا اجلاس اگلے روز کیلئے ملتوی کر دیا گیا۔ ان کے پرنسپل ہونے کے بعد ہمارے اوپر ناصر باسکٹ بال کلب کی ذمہ داری آ پڑی۔ دسواں نیشنل باسکٹ بال ٹورنامنٹ ہونے کو تھا حضرت صاحب کی خواہش پر کالج اس کی ذمہ داری قبول کر چکا تھا۔ قومی سطح کے ٹورنامنٹ کا میزبان تو سرگودھا ڈویژن تھا مگر کرنا سب کچھ ہمیں ہی تھا اور ہماری ہی کورٹس پر کھیلا جانا تھا۔ چوہدری صاحب نے صرف اتنا فرمایا تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ کالج کو اور حضرت صاحب کو کوئی شکایت نہ ہو کیونکہ کوئی ایسی بات ہوئی تو جماعت کے نام پر حرف آئے گا۔ یہاں ہمیں اپنے کمشنر سید قاسم رضوی مرحوم کا ذکر بھی کرنا ہے جنہیں اس ٹورنامنٹ کے انعقاد کا بہت شوق تھا اور وہ اس کام کے لئے ہمہ وقت تیار تھے۔

اس سلسلہ میں کئی بار انہیں ربوہ آنا پڑا وہ آئے کبھی خاموشی سے کبھی تقریباتی طور پر۔ ٹورنامنٹ کے سارے انتظامات ہم نے اپنے جلسہ سالانہ کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہی بنیادوں پر کئے تھے کیونکہ کوئی پانچ سو کھلاڑی اور بیشمار کلب اور ٹیمیں شرکت کر رہی تھیں۔ ان کی رہائش، خورد و نوش، کھیل کی پریکٹس، لانا لے جانا، میچ سب کچھ ہمارے ذمہ تھا اور کالج کے رضا کار اسی تندہی سے سب کچھ کر رہے تھے جیسے جلسہ سالانہ پر کرتے ہیں۔ کمشنر صاحب ان انتظامات کو دیکھ کر دم بخود رہ گئے کہنے لگے کہ کیا ہی اچھا ہوا کہ ٹورنامنٹ ربوہ میں ہو رہا ہے سرگودھا میں ہوتا تو میں اتنے رضا کار کہاں سے لاتا اور سرکاری ملازم بے پناہ روپیہ خرچ کرنے کے باوجود ایسا کام کبھی نہ کر سکتے۔ دسویں نیشنل باسکٹ بال ٹورنامنٹ کے سارے انتظامات اور خرچے کالج نے برداشت کئے تھے۔ کالج کا ناصر باسکٹ بال کلب ملک کا سب سے وقیع اور معزز باسکٹ بال کلب تھا اور اب تک لوگوں کو یاد ہے۔ کالج کیا گیا سب کچھ گیا۔ اب لوگ ان زمانوں کو یاد کرتے اور آہیں بھرتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا اظہار کرنے میں کوئی باک نہیں کہ ان سارے انتظامات کے دوران پرنسپل نے ہمیں ایک بار بھی یاد فرمایا نہ ٹوکا! ہم اپنے کام میں پورے آزاد اور خود مختار تھے اور الحمدللہ کہ اللہ تعالیٰ نے کامیابی سے سرخرو کیا۔ ہاں ٹورنامنٹ کامیابی سے اختتام پذیر ہو گیا تو محبت سے معانقہ فرمایا اور ہچکیوں سے روئے اور حضرت صاحب کے پاس خود لے کر گئے۔ چوہدری محمد علی صاحب احمدی ہوئے تو زندگی وقف کر کے قادیان میں گئے۔ کالج نیا نیا بنا تھا یا بن رہا تھا۔ انہیں کالج کے ہاسٹل کے سپرنٹنڈنٹ کی ہاسٹل میں ذمہ داری سونپنے کیلئے مناسب برتن تک موجود نہیں تھے۔ حضرت اماں جان تک یہ خبر پہنچی تو حضرت اماں جان نے اپنے جہیز کے سامان میں سے کچھ کئی برتن ہاسٹل کے کچن کے لئے عطا فرمائے برتنوں پر سیدہ نصرت جہاں کا نام کندہ تھا۔

قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حضرت اماں جان کی اس مادرانہ شفقت کا ذکر کرتے ہوئے چوہدری صاحب کا کیا حال ہوتا ہوگا! ہمیں تو ربوہ کے زمانہ میں فضل عمر ہاسٹل میں رہنے کا موقع ملا۔ اتفاق سے ایف۔ اے کے ایک امتحان میں ہمارے اچھے نمبر آ گئے اور ہم اپنی کلاس میں اول قرار پائے۔ وظیفہ ملا تو سیّدی حضرت پرنسپل صاحب نے ازراہِ شفقت فرمایا کہ آپ ہاسٹل میں آ جائیں۔ کیونکہ گھر پر آپ کو بجلی کی روشنی میسر نہیں ہاسٹل میں رہ کر محنت کریں تا کہ بی اے میں اچھے نمبر لے سکیں۔ ہم پرنسپل کی توقع کے مطابق اتنے اچھے نمبر تو نہ لے سکے جتنے لینا چاہئے تھے۔ مگر ایم اے کرنے کی صورت نکل آئی۔ فضل عمر ہاسٹل کا کمرہ نمبر ایک سب سے زیادہ نمبروں والے لڑکے کو دیا جاتا تھا دو سال ہم جیسے نالائق اس کمرہ پر قابض رہے۔ ہمیں یاد نہیں پڑتا کہ چوہدری صاحب نے کبھی ہم سے کسی معاملہ میں تعرض کیا ہو۔ البتہ پڑھائی کے معاملات پر ان کی پوری نگاہ رہتی تھی فضل عمر ہاسٹل کا سالانہ فنکشن کالج کی تقریبات کا ایک اہم جزو تھا۔ اس کی تیاری میں چوہدری صاحب طلباء کے ساتھ ہمہ تن مصروف رہتے۔ ایک ایک بات پر غور کرتے مناسب نامناسب کا فیصلہ کرتے اور پھر طلباء کو سال میں ایک بار اپنے اساتذہ اور کالج کے نظام کے بارے میں طنز و تفریح کی اجازت مل جاتی۔ ایک بار چوہدری صاحب نے محسوس کیا کہ پرنسپل صاحب کی چہیتی کار ''ولزلے'' کچھ زیادہ ہی مزاح کا شکار ہو رہی ہے تو انہوں نے پابندی لگا دی کہ اب کی بار پرنسپل صاحب کی ولزلے پر کچھ نہیں کہا جائیگا۔ پرنسپل صاحب تک یہ خبر پہنچی تو ان کا ارشاد آیا کہ اگر ''میری ولزلے پر کچھ نہیں کہا جائیگا تو میں اس تقریب میں نہیں آؤں گا'' چنانچہ ولزلے پر وہ شہرہ آفاق نظم اس تقریب کی

یادگار ہے۔''کھڑکھڑ کردی بوئے واگوں لنگ دی... ساڈے سجناں دی کارا ے کالے رنگ دی''خود چوہدری صاحب کی ذات اس بات پر نشانہ تضحیک بنتی کہ آپ شادی کیوں نہیں کرتے؟ لوگوں کا خیال تھا کہ شادی اس لئے نہیں کرتے کہ اس پر خرچ بہت اٹھتا ہے۔تقریباً ہر سال یہ موضوع زیر بحث آتا مگر چوہدری صاحب ہنس کر ٹال دیتے۔اس معاملہ کو نظرانداز کرنے کی حد یہ ہے کہ ان کا صاحب زادہ عزیزم اعجاز احمد جو ماشاء اللہ فوج سے کرنل ہو کر ریٹائر ہوا ہے۔کالج میں ہی رہتا اور پڑھتا اور ہمارا شاگرد تھا مگر کسی کو کانوں کان خبر نہیں تھی کہ اعجاز کون ہے۔اس کی بہن ماسٹر محمد ابراہیم شاد کی بہو اور مولانا دوست محمد شاہد کے برادر نسبتی عزیزم ادریس کی بیوی ہے اور آسٹریلیا میں رہتی ہیں۔یہ سب باتیں چوہدری صاحب کی اخفائے حال کی عادت کا شاخسانہ ہیں۔غالب نے انہی کے لئے کہہ رکھا تھا۔

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے! جب ہاسٹل کے سالانہ فنکشن میں چوہدری صاحب کی شادی زیادہ ہی زیر بحث آنے لگی تو آپا منصورہ نے جنہوں نے چوہدری صاحب کو اپنا بھائی بنایا ہوا تھا جامعہ نصرت کی ایک لیکچرار سے ان کی شادی کروادی وہ بھی اسی انجام سے دو چار ہوئی جس سے ان کی پہلی شادی دو چار ہو چکی تھی۔چوہدری صاحب طبیعت کے تنہا تھے۔ان کی شہرہ آفاق نظم تنہائی ان کی زندگی کی مکمل آئینہ دار ہے۔ان کی سیرت کا سب سے اُجلا پہلو اُن کا فلک شگاف قہقہہ تھا۔ہنستے تو دل کھول کر ہنستے۔کوئی شخص جس نے ان کو حد درجہ سنجیدگی کی حالت بلکہ ''گھور'' سنجیدگی کی حالت میں دیکھا ہو یہ گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ چوہدری صاحب اس طرح دل کھول کر ہنستے بھی ہوں گے مگر یہ ہنسی ہر ایک کے نصیب میں نہیں تھی۔حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ان سے ہمیشہ ہنسی مذاق والی بات فرماتے تھے اور فرماتے تھے کہ چوہدری صاحب کا قہقہہ سننے کو ایسی بات کہتا ہوں۔مگر چوہدری صاحب خلیفۂ وقت کی موجودگی میں قہقہہ کیسے لگائیں؟ مگر حضرت صاحب ان سے قہقہہ لگوا کر چھوڑتے تھے۔حقیقت یہ ہے کہ چوہدری صاحب کی طرز فکر ایسی تھی کہ قہقہوں کی گنجائش کم نکلتی تھی مگر کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی دوست ان سے قہقہہ لگوانے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ہاسٹل کے فنکشن میں چوہدری صاحب کے قہقہے سب سے زیادہ گونجتے تھے اور اگر کوئی بات ان پر گراں گزرتی تو سب سے زیادہ روتے بھی چوہدری صاحب ہی تھے۔ایک دفعہ ہاسٹل میں مقیم ایک لڑکا بیمار ہو گیا ڈاکٹر سے شکایت کی کہ لڑکا کسی قسم کی دوا لینے کو تیار نہیں کیا کروں؟ چوہدری صاحب خود اُٹھ کر اس کے پاس گئے اسے دوا لینے کو کہا اس کے سر ضد سوار تھی کہنے لگا میں دوا نہیں لیتا آپ میرا کیا بگاڑ لیں گے؟ چوہدری صاحب نے منت ترلہ کیا اس پر ذرا اثر نہیں ہوا سب کا خیال تھا چوہدری صاحب اس لڑکے کو زبردستی ہسپتال میں بھیج دیں گے۔چوہدری صاحب اس کے کمرہ سے باہر آئے اپنا دفتر کھلوایا اندر بیٹھ کر کمرہ مقفل کر لیا اور رونے لگے۔جب چوہدری صاحب کی ہچکیوں کی آواز باہر لوگوں تک پہنچی تو سب بہت پریشان ہوئے وہی لڑکا جواُن کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا اُٹھ کر آیا اور دروازہ سے لگ کر ترلے کرنے لگا۔خدا کیلئے دروازہ کھولیں میں آپ کی ہر بات مان لوں گا۔چوہدری صاحب ہاسٹل کے لڑکوں کے صحیح معنوں میں نگران تھے۔طالب علمی کے زمانے میں تو چوہدری صاحب ہمارے ساتھ لئے دیئے رہے مگر رفیق کار بن جانے کے بعد ان کی محبت میں نمایاں موڑ آیا۔ہماری حد درجہ حوصلہ افزائی فرماتے تھے کانووکیشن کیلئے کالج کی سالانہ رپورٹ لکھنے کا کام چوہدری صاحب کے سپرد تھا وہ ہمیں ہدایات دیکر مطمئن ہو جاتے اور رپورٹ تیار ہونے کے بعد پرنسپل صاحب سے ہماری تعریف فرماتے۔رپورٹ لکھنا چھپوانا مہمان خصوصی کو بھیجنا مہمان خصوصی کے خطبۂ تقسیم اسناد کو حاصل کرنا اور اگر مل جائے تو اسے چھپوانا تقسیم کرنا ہمارے ذمہ تھا اور یہ کام اللہ تعالیٰ کے فضل سے بخوبی ہوتا رہا چوہدری صاحب اس وجہ سے ہم پر بہت مہربان رہے۔اس دوران ان کی طبیعت کا یہ پہلو دیکھنے کا موقع ملا کہ اپنی کسی بات یا فقرے کی صحت پر اصرار نہیں کرتے تھے۔جہاں تک ان کی انگریزی کا تعلق ہے وہ تو اہل زبان جیسی انگریزی لکھتے بولتے تھے آخر گورنمنٹ کالج کے جید اساتذہ کے شاگرد رہے تھے۔ان کی اُردو زبان کی دسترس بھی قابل رشک تھی۔انہیں اساتذہ کے اردو فارسی کلام کے بیشمار حوالے زبانی یاد تھے مگر انہیں برتنے میں احتیاط کرتے تھے ان کا کہنا تھا کہ انسان کو حتی المقدور اپنی بات اپنی زبان میں ہی کہنی چاہئے۔ان کے کلام میں بھی اساتذہ کا رنگ تو ہے ان کی زبان نہیں ہے۔ہمارے کالج کی روایت رہی ہے کہ ہماری کانووکیشن کی کارروائی اُردو میں ہوتی تھی حتیٰ کہ میاں افضل حسین جیسے وائس چانسلر بھی خطبہ اسناد دینے آئے تو اپنا انگریزی میں لکھا ہوا خطبہ لائے مگر دیکھا کہ سب کچھ اُردو میں ہو رہا ہے۔تو اپنا انگریزی کا خطبہ سامنے رکھ لیا اور اُردو میں بولتے چلے گئے۔کسی کو گمان تک نہ ہوا کہ ان کا خطبہ انگریزی میں تھا۔یہ روایت حضرت مرزا ناصر احمد نے ڈالی تھی اور وہ اس پر ثابت قدم رہے۔اب ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو! وہ شاعر تھے مگر خود کو کبھی شاعر کے طور پر متعارف کروانے کی کوشش نہیں کی۔اس کی وجہ یہ بتاتے تھے کہ گورنمنٹ کالج کے زمانے میں شعر و ادب کی طرف توجہ تھی مگر احمدی ہونے کے بعد ساری توجہ دین پر مرتکز ہوگئی کبھی شاعر کے طور پر نمایاں ہونیکا خیال تک نہیں آیا۔کالج کے مشاعروں میں پرنسپل صاحب کے کہنے پر شرکت ضرور کرتے مگر ایک آدھ غزل کہتے۔لاہور کے زمانے میں ان کی شاعری کا چرچا پاک ٹی ہاؤس تک بھی پہنچا مگر ناصر کاظمی جیسے شاعر کی صحبت بھی انہیں ٹی ہاؤس کا حاضر باش نہ بنا سکی۔ہمیں اس کا تجربہ یوں ہوا کہ ناصر کاظمی نے ایک دو بار ہم سے استفسار کیا وہ تمہارے چوہدری محمد علی کہاں غائب رہتے ہیں؟ کبھی ان کو کھینچ کر یہاں لاؤ میں ان کے شعر لوگوں کو سنوانا چاہتا ہوں۔چوہدری صاحب اپنی شاعری کو اس لئے بھی اخفا میں رکھنا چاہتے تھے کہ وہ ہر چیز کو اس کی مکمل صورت میں دیکھنے کے خواہشمند تھے کوئی اُدھوری نامکمل چیز انہیں کشش نہیں کرتی تھی اور ہر چیز کو مکمل کر لینا انسان کے بس کی بات نہیں ہوتی مکمل تو صرف اللہ کی ذات ہے۔شعر کہہ تو لیتے

تھے مگر اسے چھپاتے پھرتے تھے۔کبھی کبھار کوئی شعران کی زبان پر پھسل کر آجاتا۔تو ہم لوگ مصر ہوتے کہ غزل ہوئی ہے۔سنائیں ناں نکڑ کرتے مگر پھر کچھ شعر عطا کرتے۔شعر سنانے کا ہوکا تھا نہ خواہش۔پھر بات وہیں آ گئی کہ حضرت صاحب کو ان کے شعر بہت پسند تھے ان کو کہنے کو کیسے ٹالتے؟ پہلے ان کے گھر کے مشاعروں میں شعر سنانا شروع کئے پھر کالج کے مشاعروں تک نوبت آگئی۔بات چل نکلی۔بطور شاعر ان کا چرچا خوشبو کی طرح پھیلا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع اور پھر حضرت خلیفہ المسیح الخامس ان کے شعروں کو پسند فرماتے تھے رفتہ رفتہ کلام جمع ہوا اور چھپا۔لوگ نہیں جانتے کہ ان مراحل سے گزرنا کتنا مشکل تھا اور یہ کام کتنا مشکل سے ہوا۔حضرت خلیفۃ المسیح الرابع نے تو ایک بار حکم دیا کہ آپ اپنا کلام یہاں میرے پاس چھوڑ جائیں۔میں جانوں اور آپ کا کلام !وہ جن دوفرشتوں (استاذی صاحب زادہ مرزا خورشید احمد اور برادرم مرزا غلام احمد) کا ذکر عزیزی احمد مبارک نے ان کے کلام کی رونمائی کی تقریب میں کیا ہے وہ تو خلیفہ کے مقرر کردہ فرشتے تھے۔ان کے کلام کی اشاعت میں ساری جماعت کی خواہش شامل تھی۔چوہدری صاحب کی شاعری کا اہم موڑ 1974ء کے واقعات ہیں۔

''وہ اک حسین تھا اس عہد کے حسینوں میں
اسے کسی نے تو کافر قرار دینا تھا''

اس حادثہ جانکاہ نے انہیں جیسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ان کی شاعری میں تیزی بھی آئی تندی بھی۔میں تو ان کی شاعری کے اس حصہ کو چوہتر نامہ کہا کرتا ہوں اور یہ چوہتر نامہ ہماری تاریخ کا ایک اہم ورق ہے۔ایک بات لکھ کر اس مضمون کو سمیٹتا ہوں۔میں نے کسی استاد کو اپنے طلبا میں اتنا مقبول اور ہر دلعزیز نہیں پایا جتنا چوہدری صاحب تھے ان سے پڑھنے والے تو انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں کیونکہ فلسفہ کوئی ایسا مقبول مضمون نہیں رہا ہم نے چوہدری صاحب سے کلاس میں ایک دن بھی کوئی مضمون نہیں پڑھا مگر ہم ان کا شاگرد کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔چوہدری صاحب ہاسٹل کے سپرنٹنڈنٹ رہے اور سپرنٹنڈنٹ سے ہزار قسم کی سختیاں ہاسٹل میں رہنے والوں پر ہوجاتی ہیں مگر حیرت کی بات ہے کہ ہمارے فضل عمر ہاسٹل میں رہنے والے ہاسٹل سے چلے جانے کے بعد بھی چوہدری صاحب کے متوالے رہے۔میں نے یورپ

میں بھی ان کے شاگرد دیکھے امریکہ میں بھی پاکستان میں بھی نہ صرف شاگرد بلکہ کھلاڑی بھی چوہدری صاحب کے حسن سلوک کے گرویدہ رہے۔یہاں کینیڈا میں باسکٹ بال کا ایک نامور کھلاڑی والیس جو پاکستان کی پولیس ٹیم کا رکن تھا وینکوور سے پانچ گھنٹے کا ہوائی سفر کرکے محض چوہدری صاحب سے ملنے کوٹورانٹو آیا تھا۔جس جس کو ان کی وفات کی خبر پہنچی ہوگی اس نے ضرور ان کی مغفرت کی دعا کی ہوگی۔اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔آمین۔

ملکہ عالیہ برطانیہ نے ۱۰ نومبر ۲۰۱۵ء کو ڈاکٹر سر افتخار احمد ایاز لندن کو Sir کے خطاب سے نوازا۔

رپورٹ: سہیل لون

ملکہ الزبتھ ثانی سال میں دو مرتبہ اعزازات کا اعلان کرتی ہیں۔ایک تو سال نو کے موقع پر اور پھر اپنی رسمی سالگرہ کے موقع پر جو سرکاری طور پر جون کے دوسرے ہفتہ کے روز منائی جاتی ہے۔ملکہ معظّمہ کی تاریخ پیدائش تو 21 اپریل 1926ء ہے لیکن سرکاری طور پر اس کو جون میں منایا جاتا ہے۔اعلانات کے بعد اعزازات دینے کی تقاریب ہوتی ہیں جسے Investiture کہتے ہیں۔سال کے دوران 25 Investitures منعقد کئے جاتے ہیں۔ان میں سے ایک ایڈنبرا سکاٹ لینڈ میں Holy rood house میں ہوتا ہے۔باقی سارے بکنگھم پیلس لندن میں ہوتے ہیں۔جب ملکہ خود Investiture کے لئے نہ آسکیں تو ان کی جگہ ان کے بیٹے پرنس چارلس یا شاہی خاندان کا کوئی اور فرد آجاتا ہے۔ایک Investiture میں قریباً 120 لوگ اعزازات حاصل کرنے کے لئے شامل ہوتے ہیں۔بکنگھم پیلس کا ذکر ہوا ہے۔اس کے بارہ میں بھی کچھ بتا دینا دلچسپ ہوگا۔لندن جو بھی سیر کے لئے آتا ہے وہ بکنگھم پیلس تو ضرور دیکھ کر جاتا ہے۔لاکھوں لوگ ہر سال شاہی خاندان کی یہ رہائش گاہ دیکھنے آتے ہیں۔خاص طور پر وہ پریڈ جب گارڈز بدلتے ہیں یعنی جب ایک دستہ دوسرے دستے کو ذمہ داری دے کر رخصت ہوتا ہے۔ان کی یونیفارم اور پریڈ کا انداز ایک دلکش منظر ہوتا ہے۔

اس پیلس کی جو صورت آج نظر آتی ہے اس میں کافی ردّوبدل ہوتا رہا ہے۔اصل بلڈنگ کوئی خاص نہیں تھی یہ 1703ء میں ڈیوک آف بکنگھم کی ذاتی رہائش کے لئے بنائی گئی تھی۔اس پر اس کا نام بکنگھم ہاؤس رکھا گیا تھا۔یہ گھر جارج ثالث نے 1761ء میں اپنی بیگم ملکہ شارلٹ کی رہائش کے لئے خرید لیا۔اس پر بکنگھم ہاؤس کے بجائے اس کا نام کوئینز ہاؤس رکھ دیا گیا۔1762ء میں ملکہ شارلٹ نے اپنی سہولت کے لئے اس مکان میں کافی تبدیلیاں کرائیں اور کثیر رقم خرچ کی تھی تو 73 ہزار پونڈ لیکن اس وقت کے حساب سے بڑی رقم تھی۔پھر جب جارج ثالث کا بیٹا تخت پر آیا تو اس نے کوئینز ہاؤس کو وسیع کرنے کے لئے پارلیمنٹ کو تین چار لاکھ پونڈ منظور کرنے کے لئے کہا اور ایک آرکیٹیکٹ جان نیش کو کہا کہ وہ اس ہاؤس کو پیلس میں بدل دے جو شاہی خاندان

کی رہائش کے لائق ہو۔نیش نے کافی حصے گرا کر دوبارہ تعمیر کرائے اور صحن میں ایک ماربل آرچ بھی بنوائی۔ یہ ماربل آرچ اب پیلس کے باہر ہائیڈ پارک کارنر میں ہے۔ یہ منصوبہ 1826ء میں شروع ہوا اور اس پر لاپرواہی سے خرچ کیا گیا۔ 1829ء تک پانچ لاکھ پونڈ سے اوپر خرچ کیا جا چکا تھا۔ یہاں تک کہ نیش کو برطرف کر دیا گیا۔ اور چند سال تک یہ مکان خالی پڑا رہا۔ 1837ء میں جب ملکہ وکٹوریہ کا دور شروع ہوا تو اس نے دیکھا کہ جو عمارت بنائی گئی تھی اس میں بہت سی خامیاں ہیں اور وہ رہائش کے قابل نہیں چنانچہ ایک اور آرکیٹیکٹ رکھا گیا اور کافی ردّ و بدل کیا گیا۔ یہ سلسلہ جنگِ عظیم تک چلتا رہا اور پھر جنگ عظیم کے دوران 1940 میں اس پیلس پر سات دفعہ بم گرائے گئے اور عبادت کے لئے اس میں جو چرچ بنایا تھا وہ تباہ کر دیا گیا۔ آج جو بکنگھم پیلس ہمارے سامنے ہے اس میں 775 کمرے ہیں۔ ان میں 19 کمرے شاہی رہائش گاہ کے لئے ہیں۔ 240 بیڈروم ہیں۔ 92 دفتر ہیں۔ 78 غسلخانے ہیں۔ ہر سال قریباً پچاس ہزار لوگ مختلف تقاریب کے لئے پیلس میں آتے ہیں۔ ویسے روز مرہ کے معمول میں اس پیلس میں ملکہ کے دفاتر چلتے ہیں۔ ملکہ کے خاوند پرنس فلپ کے الگ دفتر ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں پیلس کی سیر کے لئے لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے اور اس میں پیلس کی عمارت سے بڑھ کر ملکہ کی کشش ہے۔

Invetitures کی تقاریب بکنگھم پیلس کے Ball روم میں ہوتی ہیں۔ ملکہ تقریب کے لئے دو افسروں کے ساتھ آتی ہیں۔ یہ طریق ملکہ وکٹوریہ نے 1876ء میں شروع کیا تھا۔ علاوہ ازیں سٹیج پر ملکہ کے پانچ باڈی گارڈ ہوتے ہیں۔ یہ طریق ہی کنگ ہنری ہفتم کے زمانہ میں 1485ء میں شروع ہوا تھا۔ کنگ ہنری Bosworth Field کی فتح کے بعد اپنے لئے پانچ باڈی گارڈز کا دستہ مقرر کیا تھا اور یہ دستہ اب بھی پانچ باڈی گارڈز پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ چار افسر ملکہ کے ساتھ ڈیوٹی پر ہوتے ہیں اور وہ اعزاز لینے والوں اور ان کے مہمانوں کی نشستوں اور تقریب کے انتظامات کا خیال رکھتے ہیں۔ موسیقی کا انتظام بھی ہوتا ہے جو ملٹری کا ایک آرکیسٹرا پیش کرتا ہے۔ ملکہ کے آنے پر قومی ترانہ پیش کیا جاتا ہے اور پھر ایک افسر ملکہ کے دائیں ہاتھ کھڑا ہو کر مائیک پر ہر ایک اعزاز کا باری باری اعلان کرتا ہے اور اعزاز حاصل کرنے والا ایک ساتھ والے دروازے سے بال روم کے اندر داخل ہو کر ملکہ کے قریب کھڑا ہو جاتا ہے مائیک پر یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ یہ اعزاز کس وجہ سے دیا جا رہا ہے۔ ملکہ کے قریب کھڑے ایک اور افسر کے ہاتھ میں Velvet کا ایک تکیہ ہوتا ہے جس کے اوپر وہ تمغہ یا جو بھی اعزازی نشان ہو رکھ کر ملکہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ ساتھ ایک دوسرا سینئر افسر بھی ہوتا ہے جو چیک کرتا ہے کہ صحیح تمغہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ملکہ تمغہ لے کر اعزاز حاصل کرنے والے یا والی کو لگا دیتی یا پہنا دیتی ہے۔

ان لمحات کے دوران وہ بات بھی کرتی ہے اور بعض دفعہ یہ گفتگو تمغہ لگا دینے کے بعد بھی ایک دو منٹ کے لئے جاری رہتی ہے۔ جن کو نائٹ ہڈ کا اعزاز ملتا ہے ان کے لئے ایک چھوٹا سا سٹول ہوتا ہے جس کے اوپر ایک خوبصورت ویلویٹ کا تکیہ ہوتا ہے۔ وہ اس کے اوپر دایاں گھٹنا رکھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور ملکہ ان کو اپنے Knights میں شامل کرنے کے لئے ایک تاریخی تلوار سے پہلے ان کے دائیں اور پھر بائیں کندھے کو چھوتی ہے۔ یہ تلوار ملکہ کے والد محترم کنگ جارج ششم کے استعمال میں تھی جب وہ بحیثیت ڈیوک آف یارک سکاٹس گارڈز کے کرنل تھے۔ اس طرح اعزازات دینے کی یہ کارروائی چلتی رہتی ہے۔ اعزازات مختلف آرڈرز کے تحت دیئے جاتے ہیں اور ان میں سب سے زیادہ معروف آرڈر۔ آرڈر آف دی برٹش ایمپائر ہے۔ اکثر لوگوں کی ممبر آف دی برٹش ایمپائر MBE کا اعزاز ملتا ہے۔ اس سے بڑھ کر افسر کا رتبہ ہے اور پھر کمانڈر کا اور اس آرڈر کا اعلیٰ ترین ایوارڈ KBE یعنی نائٹ کمانڈر ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ نائٹ ہڈ کسی کو زندگی میں ایک ہی مرتبہ ملتا ہے۔ بعض اور بھی اعزازات ہیں جو مخصوص آرڈرز سے باہر ہیں۔ ان میں ملکہ کے سروس میڈل ہیں۔ جیسے پولیس میڈل، ریڈ کراس میڈل۔ اسی طرح بہادری اور شجاعت کے میڈل بھی ہیں۔ اگر کوئی اپنا میڈل حاصل کرنے سے پہلے فوت ہو جائے تو میڈل اس کے ورثاء کو دے دیا جاتا ہے لیکن آرڈر کے تحت جو اعزازات دیئے جاتے ہیں جیسے ایم بی ای یا او بی ای وغیرہ وہ وفات کی صورت میں ورثاء کو نہیں دیئے جاتے۔

ان اعزازات کی دفتری کارروائی کے لئے اور پھر اعزازات کی تقریب کے انتظامات کے لئے ایک الگ ڈیپارٹمنٹ ہے جو سارا سال انہی کاموں میں مشغول رہتا ہے۔ اگر کوئی ملک سے باہر ہو اور ملکہ سے اعزاز حاصل کرنے کے لئے موجود نہ ہو سکے تو ملکہ کے نمائندے یعنی گورنر سے یہ اعزاز حاصل کر سکتا ہے یا پھر برٹش ایمبسڈر سے لے سکتا ہے۔ شاہی اعزازات میں سب سے اعلیٰ اور ارفع برٹش ایمپائر کا آرڈر ہے۔ اس کے تحت برٹش فرمانروا کی طرف سے بہادری اور اولوالعزمی پر اعزازات دیئے جاتے ہیں۔ فوج میں خدمات کے علاوہ سول سوسائٹی کی خدمات یا سائنس یا ٹیکنالوجی میں خاص خدمات پر بھی اعزازات دیئے جاتے ہیں۔ برٹش ایمپائر کا آرڈر کنگ جارج پنجم نے 4 جون 1917ء کو جاری کیا تھا۔ اس کے تحت پانچ ملٹری اور سول اعزازات دیئے جاتے ہیں۔ ان میں سے اعلیٰ ترین نائٹ کا اعزاز ہے۔ یہ اعزازات ایم بی ای سے شروع ہوتے ہیں۔ اس سے اوپر او بی ای ہے اور پھر سی بی ای اور پھر کے بی ای اور جی بی ای۔ نائٹ ہڈ کے ساتھ سر کا خطاب ہے۔ عورتوں کو DAME کا خطاب دیا جاتا ہے۔ ان اعزازات کے لئے وزیراعظم یا گورنرز کی طرف سے ملکہ کی خدمت میں سفارش پیش کی جاتی ہے۔ ایک سال میں ساری دنیا میں جہاں جہاں بھی ملکہ ہیڈ آف سٹیٹ ہے زیادہ سے زیادہ 845 نائٹ کمانڈرز بنائے جا سکتے ہیں۔ 858 او بی ای اور 1464 ایم بی ای لیکن عموماً تعداد کم ہی ہوتی ہے۔ جب سے اس

آرڈر کا 1917 میں آغاز ہوا تھا اب تک قریباً ایک لاکھ لوگوں کو اعزازات مل چکے ہیں لیکن ان میں نائٹ کا اعزاز ملنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ امسال 13 جون کو ملکہ کے برتھ ڈے کے موقع پر مجھے KBE کا یعنی نائٹ کمانڈر کا اعزاز دیا گیا۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور احمدیت اور خلافت احمدیہ کی برکات کے باعث تھا۔ اس اعزاز کے ساتھ سر کا خطاب بھی ہے۔ اعزازات دیئے جانے کے لئے بکنگھم پیلس میں تقریب یعنی Investiture Ceremony کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ مجھے اس کے لئے 10 نومبر 2015ء کو Investiture میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی۔ اس کے لئے صبح دس بجے پیلس گئے۔ میرے ساتھ میری بیگم لیڈی امۃ الباسط اور دو بیٹیاں بشریٰ اور فرزانہ تھیں۔ پیلس میں داخل ہوتے ہی خوبصورت یونیفارم میں ملبوس گارڈز نے ہمارا استقبال کیا اور گارڈز مہمانوں کو الگ ہال میں لے گئے اور مجھے الگ ہال میں جہاں اعزاز حاصل کرنے والوں کے لئے Reception کا انتظام تھا۔ یہ ہال پیلس کے بال روم کے ساتھ تھا اور اس میں ایک دروازہ تھا جس میں سے بال روم میں داخل ہو سکتے ہیں۔ یہاں اعزاز حاصل کرنے کی جو تقریب ہے اس کی تفصیل بتاتے ہیں اور ریہرسل بھی کرا دیتے ہیں۔ بال روم میں مہمانوں کے لئے قریباً 150 کرسیاں ہیں۔ سامنے سٹیج ہے جس پر ملکہ کھڑے ہو کر اعزازات دیتی ہے۔ اس تقریب میں KBE کا صرف ایک اعزاز تھا جو احمدیت کے ادنیٰ ترین خادم افتخار ایاز کے لئے تھا۔ آڈر آف برٹش ایمپائر کا یہ اعلیٰ ترین ایوارڈ ہے۔ اس کے لئے ملکہ نے سب سے پہلے مجھے بلایا۔ بلانے کا طریق یہ ہے کہ ملکہ کے دائیں ہاتھ ایک افسر مائیک پر اعزاز اور اس کے حاصل کرنے والے کا نام پڑھ کر سناتا ہے اور اس پر اعزاز حاصل کرنے والا بال روم کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ جب میں بال روم کے اندر آیا تو میرے دل سے یہ آواز نکلی کہ یا اللہ میں تیرے مسیح کا ایک ادنیٰ غلام ہوں تو اس ملکہ اور اس کے خاندان کو مسیح الزمان کا نور عطا کر۔ پھر جب میں ملکہ کے پاس آیا تو وہاں ایک چھوٹا سا سٹول تھا جس کے اوپر ویلویٹ کا ایک خوبصورت تکیہ تھا اس پر دایاں گھٹنا ٹیک کر مجھے بیٹھنا تھا تا ملکہ اپنی روایتی تلوار سے پہلے میرے دائیں کندھے اور پھر بائیں کندھے کو چھو سکے۔ اس کے بعد میں ملکہ کے قریب اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ملکہ نے میرے گلے میں نائٹ ہڈ کا میڈل ربن کے ساتھ پہنایا اور پھر نائٹ کمانڈر کا بہت ہی خوبصورت ستارہ نما Insignia میرے کوٹ پر لگا دیا۔ پھر خود ہی کہنے لگیں تم پہلے بھی مجھ سے اعزاز لے چکے ہو (او بی ای کا اعزاز 1998 میں دیا تھا)۔ تم نے Realms کی بہت خدمت کی ہے۔ میں نے ملکہ کو برطانیہ کی سب سے زیادہ لمبا عرصہ فرمانروا رہنے پر مبارک باد دی۔ ان سے پہلے سب سے زیادہ لمبا عرصہ تخت پر رہنے والی ان کی دادی ملکہ وکٹوریہ تھیں اور 8 ستمبر 2015ء سے اب یہ ہیں۔

مبارک باد کے ساتھ دعا دی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دونوں جہانوں کی برکتیں عطا کرے۔ مختصر سی گفتگو تھی۔ اس کے بعد ایک شاہی گارڈ نے مجھے ایک مخصوص جگہ پر بٹھا دیا۔ پھر دوسرے لوگوں کو اعزازات دیئے جانے کا سلسلہ جاری رہا اور یہ تقریب تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہی۔ پھر نیشنل اینتھم ہوا اور ملکہ اپنے گورکھا محافظوں کے ساتھ واپس چلی گئی۔ پیلس کے اندر تصویریں لینی منع ہیں لیکن ایک کمپنی کو اجازت ہے۔ انہوں نے پیلس کے اندر کیمرے لگائے ہوئے ہیں جو نظر نہیں آتے لیکن وہ سارا پروگرام وڈیو کرتے ہیں اور پھر ان سے یہ وڈیو خریدا جا سکتا ہے۔ پیلس کے باہر کورٹ یارڈ میں تصویریں لی جا سکتی ہیں اور کمرشل فوٹو گرافر بھی ہوتے ہیں جن سے تصویریں بنوائی جا سکتی ہیں۔ اعزاز ملنے کے بعد جب میں بال روم میں بیٹھا ہوا تھا تو میں نے اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا اور بہت دعا کی کہ یہ اعزاز جماعت کے لئے بہت بہت مبارک ہو اور پھر سارا وقت درود شریف پڑھنے میں گزارا اس نیت سے کہ درود شریف کی برکت سے اس محل کے رہنے والوں کو رسول کریم ﷺ کی شفاعت نصیب ہو۔ قارئین سے بھی دعا کی درخواست ہے کہ یہ اعزاز جماعت احمدیہ کے لئے مثمر ثمرات ہو۔ آمین

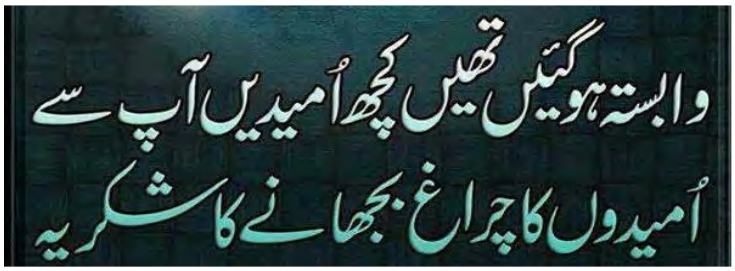

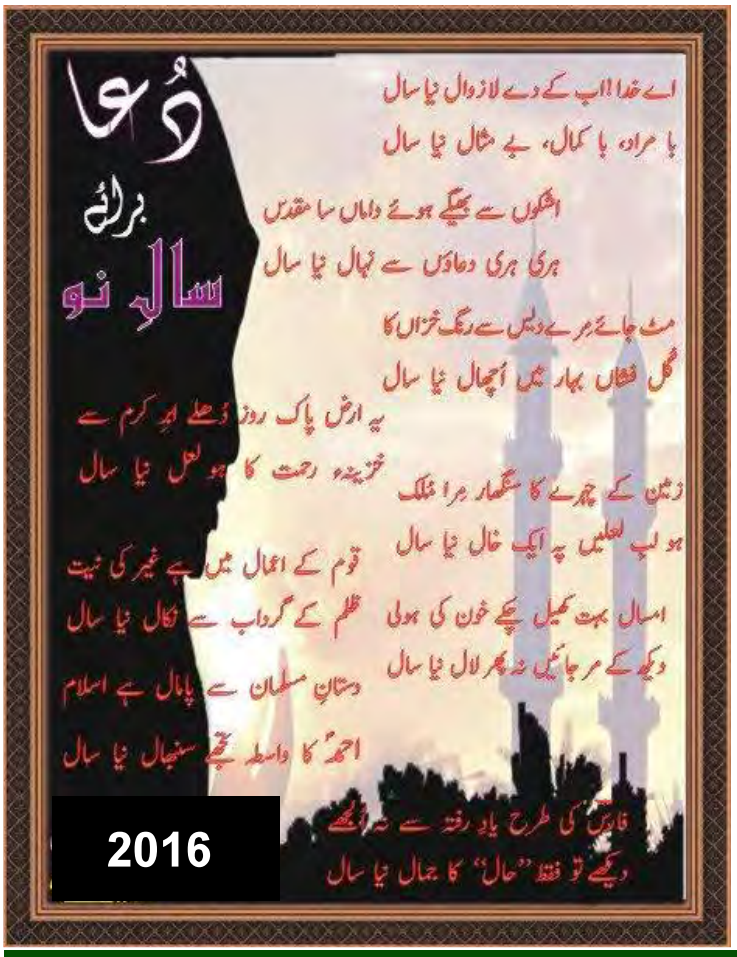

افسانہ

امانت

امجد مرزا امجد

اندھیرا آہستہ آہستہ اپنی کالی چادر پھیلاتا ہوا ہر سو پھیل گیا تھا، اور کمرے میں بھی اتنی تاریکی تھی کہ فرش پر بچھے ہوئے مصلّے پر بیٹھا ہوا وہ کسی کو نظر نہ آتا... مگر اسے کس نے دیکھنے آنا تھا، کتنی مدت گذر گئی اسے اپنا آپ دیکھے ہوئے... زندگی کئی بار محرومیوں کا اس طرح شکار ہو جاتی ہے کہ انسان کو اپنا آپ بھی نظر نہیں آتا... برسوں سے وہ اپنے ہی گھر میں ایک ایسی اجنبیّت کی زندگی گذار رہا تھا کہ اس کے گھر میں رہنے والے وہ کرایہ دار جو کئی کئی سالوں سے وہاں رہ رہے تھے اس اجنبیّت کی دیوار کو پھلانگ نہ سکے... انسان جب اپنے آپ کو زندگی کی صرف ان چیزوں تک محدود کر لے جو فقط زندہ رہنے کے لئے ناگزیر ہوں، اور اپنے اردگرد کے ماحول سے بے بہرہ ہو جائے تو یہ بے نیازی اس کے گرد اجنبیّت کی ایسی فصیل تعمیر کر دیتی ہے جس میں وہ ہمیشہ کے لئے محبوس ہو کر رہ جاتا ہے... لوگ تو ہمیشہ کھلے رستوں اور وا دروازوں سے گذرتے ہیں آجکل کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ وہ دیواریں پھلانگے... یوسف بھی ایک ایسی ہی قید کا اسیر تھا، مگر اس نے اس تنہائی کو اللہ کی عبادت کے سانچے میں ڈھال کر اپنے اوپر ایسا سحر طاری کر لیا کہ وقت کی مسافت کا احساس ختم ہو گیا۔ اور یوں برسوں بیت گئے... مگر کئی درد ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی ٹیس روح کے دریچوں میں سدا سرسراتی رہتی ہے... مغرب کی نماز کے بعد یوسف آنکھیں بند کئے سر جھکائے تسبیحات میں منہمک تھا کہ کسی نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا... دوسری بار کھٹکھٹانے پر وہ چونکا... کوئی اجنبی ہی ہوگا، اس نے سوچا کیونکہ گھر میں رہنے والوں پر یہ پابندی تھی کہ مغرب کی نماز سے عشاء تک اسے بالکل مخل نہ کیا جائے... وہ بادلِ ناخواستہ اٹھا اور کمرے کا دروازہ کھولا، ''السلام علیکم... آپ... راجہ یوسف صاحب ہیں ؟'' اجنبی کے لہجے میں جھجک تھی۔

''جی ! میں ہی یوسف ہوں ... فرمایئے؟'' وہ آنے والے کے مردانہ حسن و وجاہت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ لہجہ کی شائستگی اور آواز کی مٹھاس کانوں میں رس گھول گئی... ''معاف کیجئے گا بزرگوار ! مجھے گھر میں داخل ہوتے ہی متنبّہ کیا گیا تھا کہ شام کے وقت آپ عبادت میں مصروف ہونے کے باعث ڈسٹرب ہونا پسند نہیں فرماتے... مگر...'' اُس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور اپنی بکھری ہوئی سانسوں پر قابو پا کر کہا ''میں بہت دور سے آیا ہوں... اور آپ سے ملاقات بے حد ضروری تھی جی!'' ''اچھا!'' یوسف کی حیرانگی عروج پر تھی مخاطب اس کے لئے قطعی اجنبی تھا۔ ''آؤ آؤ بیٹے ... اندر آجاؤ۔'' وہ اجنبی کو اندر کمرے میں لے آیا فرش پر بچھا ہوا جائے نماز تہہ کیا اور کرسی کی پُشت پر رکھا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا، نوجوان کرسی پر بیٹھ گیا لیکن اس کے چہرے پر الجھن کے گہرے سائے یوسف کی زمانہ شناس نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھے، وہ سر جھکائے اپنا نچلا ہونٹ مسلسل کاٹ رہا تھا اس کو بار بار لمبی سانسیں لیتے دیکھ کر یوسف نے پہل کی اور بولا ''میں ایک غیر معروف گوشہ نشیں قسم کا انسان ہوں اور معلوم نہیں تمہاری کوئی مدد کر سکوں گا یا نہیں... تمہیں کوئی پریشانی ہے تو بھلا جھجک کہو، اللہ مسبّب الاسباب ہے شاید کوئی راستہ نکل آئے...!''

''جی ! میں سوچ رہا ہوں کہ بات کہاں سے شروع کروں... اُس حرماں نصیب ماں سے، جو ایک بیٹے کو جنم دے کر چند ماہ زندگی اور موت سے لڑتی رہی اور اپنی حسرتوں کو دل میں لئے زمین اوڑھ کر ہمیشہ کے لئے سو گئی... یا پھر اُس بدنصیب باپ سے شروع کروں... جو چند ماہ کا روتا بلبلاتا بچہ گود میں لئے... غم و یاس کی تصویر بنا قبرستان میں اپنی شریکِ حیات کی قبر پر بیٹھا روتا رہتا اور قبر پر ہاتھ مار مار کر چیختا کہ تُو کیوں روٹھ کر چلی گئی۔۔۔ کوئی پیار کرنے والوں کو کبھی اس طرح چھوڑ کر بھی جاتا ہے ... دیکھ تیرا بیٹا تیری جدائی میں کس طرح تڑپ تڑپ کر رو رہا ہے...''

یوسف نے اسے چونک کر دیکھا اور سر جھکا کر رونے لگا... نوجوان کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں مگر وہ بڑی قوّت سے اس سمندر کو روکے ہوئے تھا، اسے معلوم تھا کہ ایک بار برداشت کا یہ بند ٹوٹ گیا تو وہ خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے گا۔ وہ پھر گویا ہوا۔ ''اور راجہ صاحب ! یا یہ روح فرسا کہانی اُس خائن اور کج ادا بیوفا شخص سے شروع کروں جو دوست بن کر سانپ سے بھی زہریلا نکلا، اور اپنی محبت کی پیاس بجھانے کے لئے برسوں کی دوستی اور بھائی چارے کا خون کر دیا۔۔ اور یا پھر ... اُس بدبخت بچے سے شروع کروں جو بچپن سے لیکر جوانی تک محبت اور رشتوں کے دوراہے پر کھڑا ہے... اسے نہ ہی کوئی راستہ نظر آتا ہے اور نہ کوئی منزل...''

اور پھر جذبات کے ایک ریلے نے سارے بند توڑ دیئے اور وہ سسکیاں لے کر رونے لگا یوسف کانپتے ہوئے اٹھا اور اس کے پاس کھڑا ہو گیا اور اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے اس کے خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپتے ہوئے جسم کو چھوا... سر جھکائے بیٹھے نوجوان کو جیسے بجلی کی ننگی تار نے چھو لیا ہو وہ چونکا... یوسف کے ہاتھوں نے اُسے آہستہ سے اٹھایا اور وہ ایک مقناطیسی قوّت کے زیرِ اثر اٹھتا چلا گیا، دونوں مرد ایک دوسرے کے سامنے کھڑے چند لمحے ایک دوسرے کو کانپتے ہونٹوں اور بہتی آنکھوں سے دیکھتے رہے... یہ ایک ایسا لمحہ تھا جب دنیا ساکت ہو جاتی ہے، زندگی سانس لینا بند کر دیتی ہے، وقت کی سوئی رک جاتی ہے، احساس کا پیمانہ یخ بستہ ہو کر مردہ ہو جاتا ہے اور صدیاں بیت جاتی ہیں... ''اوہ میری جان...!'' یوسف کی رندھی ہوئی آواز نکلی ''ابو جی...!'' اور وہ یوسف کے سینے سے چمٹ گیا... دونوں باپ بیٹا دیر تک لپٹے برسوں سے دل میں بند محبتیں ایک دوسرے کے سینوں میں منتقل کرتے رہے... آنکھیں برستی رہیں سانسیں مچلتی رہیں...

اجالوں کی غزل کا شاعر۔اے حق

اسحاق ساجد۔مدیر اعلیٰ ماہنامہ سمندانٹرنیشنل جرمنی

لندن کے جناب اے حق صاحب کا شعری مجموعہ ’’صدائے حق‘‘ کا مسودہ میرے سامنے پڑا ہے، یہ کیا ہے؟ سخنوری کا یا ک بحرِ بیکراں، ہزاروں پہلو اور ہر پہلو انگنت رُخ و انداز لئے ہوئے، مشکل میں ہوں کہ کیسے احاطہ کیا جائے!!! ذہن و فکر تک رسائی ممکن نہیں مگر میں اپنی کم نگاہی کا اعتراف کرتا ہوں۔حق صاحب کی شاعری کے چند پہلوؤں پر نظر ڈالنے کی جسارت کروں گا کہ شاعر کو شاعر کہہ سکوں۔شاعری کی دنیا میں زمین بہت سخت اور فلک بہت دور ہوتے ہیں۔آئے دن شہرتیں بنتی اور مسمار ہوتی ہیں۔دنیائے ادب میں اپنی پہچان قائم کرنا آسان کام نہیں۔غزل حسن پرست صفت سخن ہے اور اس کا مطلب روایت پسندوں کے مطابق زہرہ وجبینوں سے گفتگو ہوتا ہے۔بقول میر ’’کیا ہے شعر کو پردہ سخن کا‘‘ اور یہی وجہ ہے کہ غزل کے ہر شاعر کو کسی نہ کسی شہناز لالہ رُخ کی زُلف گرہ گیر کا اسیر اور ہجر و وصال اور واردات کی شاعری کو اس کا پیدائشی حق تصور کیا جاتا ہے۔یہ غزل کے کلاسیکی مزاج سے بھی مطابقت رکھتی ہے حق صاحب جدید دور کے شاعر ہیں لہذا یہ مطابقت ان کے ہاں بھی نظر آتی ہے اُن کی سخنوری کی پارسائی کا یہ بھی ایک حق سمجھ لیجئے کہ وہ غزل کے روایتی محبوب سے ہرگز کنارہ کشی اختیار نہیں کر سکتے ان کے متعدد اشعار میں محبوب کے سراپا کی تعریف موجود ہے جذباتی تلاطم کا ایک موسم سا لطف انگیز آہنگ ہے جو اپنی منفرد لے سے قلبی تاروں کو چھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور اس کی مثال نئے موسم کی جستجو میں محو پرواز صحت مند طائر کی سی ہے۔حق صاحب کی غزل میں ان کے خواب محل کے ساتوں دروازوں کے درمیان ان کی کی اپنی سی سوچوں کے سلسلے ان کے فن کا محور ہیں اس خواب محل میں دریا بھی ہیں، صحرائی سہارے بھی ہیں اور خزاؤں کے مسکن بھی۔مہکتے ہوئے گلاب بھی ہیں تو ببول کے خاردار اشجار بے سایہ بھی۔چاند بھی ہیں تو سورج بھی ضیائے نجوم بھی ہیں تو تاریکیاں بھی سمندوروں کی خروش بھی ہے اور ساحلوں کی سروش بھی، قوس وقزاح کے جلتے بجھتے رنگ بھی ہیں تو تنہائی کی بے رنگی بھی، شام وصال بھی ہے تو صبح ملال بھی خیال کی تتلیاں بھی ہیں تو انکے پروں سے رنگ چراتے ہوئے حقیقت کے عذاب بھی ،آسمانوں کے خزانے بھی ہیں تو زمین کا بنجر پن بھی، غرض کہ حق کی شاعری گوں نہ گوں رنگوں اور بدلتے رنگوں کے ذائقوں کا امتزاج اور جمالیات شعور کی ایک ڈوری ہے جو فکر یا جزاء کو جوڑے ہوئے ہے انتخابِ ردیف کئی غزلات میں منفرد ہیں جو قاری کو مطالعہ کے لئے بار بار اُکساتی ہے۔اے حق کے کلام کے بارے میں اگر بہت کم الفاظ میں کچھ کہا جا سکتا ہے تو یہی کہ ان کی غزل آج کے ماحول کا آئینہ دار ہے جس میں فکر کی وہ آنچ موجود ہے جو پڑھنے سننے والے کے دل کو گرما دیتی ہے۔اپنی اس مختصر تربات کا اختتام حق کے ہی ایک شعر کے حوالہ سے کرتا ہوں ؎

حقیقت میری تم پر کھلے گی　　میں گم اپنے افسانے میں رہا ہوں

اطہر نفیس

بلال افتخار

21 نومبر اردو کے معروف شاعر اطہر نفیس کا یومِ وفات ہے۔

اطہر نفیس کا اصل نام کنور اطہر علی خاں تھا اطہر نفیس کی پیدائش علی گڑھ کے قصبہ پٹل کے ایک معزز خاندان میں 22 فروری 1933 کو ہوئی تھی۔ان کی ابتدائی تعلیم علی گڑھ میں ہی ہوئی۔علی گڑھ کے قصبہ پٹل سے ہجرت کر کے وہ 1949 میں کراچی چلے گئے تھے۔اطہر نفیس نے تمام عمر تنہا گزاری اور کسی کو اپنا شریک حیات نہیں بنایا۔یوں تو شعر گوئی کا آغاز علی گڑھ ہی میں ہو گیا تھا لیکن سنجیدگی اور باقاعدگی کے ساتھ شعر کہنے کا سلسلہ کراچی آ کر شروع ہوا او وہاں مشہور اخبار ’’جنگ‘‘ کے انتظامی شعبے سے وابستہ ہوئے اور ترقی کر کے چیف اکاؤنٹنٹ کے عہدے پر پہنچے۔اطہر نفیس صرف شاعر نہیں بلکہ صحافی بھی تھے۔انہوں نے پاکستان کے مشہور اخبار ’’جنگ‘‘ میں کالم اور حالاتِ حاضرہ پر مضامین بھی لکھے۔لیکن اطہر نفیس پر اس اخبار میں انتظامی ذمہ داریاں بھی تھیں اس لیے وہ لکھنے، پڑھنے پر بہت زیادہ وقت نہیں دے سکے۔یہ حقیقت ہے کہ اطہر نفیس کے اندر ایک منفرد شاعر موجود تھا۔جس کی فکر الگ تھی، محسوسات الگ تھے، سوچنے کا انداز الگ تھا اور ادائیگی بھی الگ تھی۔وہ منفرد اسلوب کے مالک تھے۔اطہر نفیس جس دور میں شاعری کر رہے تھے اس زمانے میں کئی ایسے شعراء موجود تھے جو اپنے اسلوب کے لحاظ سے منفرد انداز رکھتے تھے۔ان میں ان سے فیض احمد فیض، منیر نیازی، حبیب جالب وغیرہ تھے تو ہم عصروں میں ابن انشا، مصطفیٰ زیدی، شکیب جلالی، اقبال ساجد اور عزیز حامد مدنی وغیرہ تھے۔لیکن اطہر نفیس نے ان کے درمیان سے ایک نئی راہ نکالی۔ان کے یہاں بہت سادگی ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام اہم گلوکاروں نے ان کی غزلوں کو اپنی آواز دی ہے۔کیوں کہ یہ اشعار بہت آسانی سے سامعین کے ذہن میں اُتر جاتے ہیں اور دل پر اثر کرتے ہیں۔

اطہر نفیس کے ہاں عصری مسائل تو موجود ہیں ہی جن کو انہوں نے اپنے احساسات میں تپا کر نیا اسلوب بخشا ہے، لیکن ساتھ ساتھ انہوں نے تصوف کے مسائل بھی بیان کیے ہیں۔اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا معرفت سے گہرا لگاؤ تھا۔احمد حسین صدیقی ’دبستانوں کا دبستان کراچی‘ میں لکھتے ہیں کہ اطہر نفیس کو بابا ذہین شاہ تاجی سے بے حد عقیدت تھی۔مذہب سے بھی ان کا گہرا لگاؤ تھا۔حالانکہ وہ زندگی بھر ناخدا رہے، لیکن اپنے بھانجوں اور بھتیجوں سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔اس لیے انہوں نے زندگی کے درد کو بخوبی سمجھا تھا۔‘‘ اطہر نفیس کا کلاسیکی شاعری سے بھی بہت لگاؤ تھا۔حالانکہ وہ جدید اسلوب کے شاعر ہیں، مگر اس کے باوجود ان کے یہاں کلاسیکی روایات کا التزام ملتا ہے اور اس نے ان کی شاعری کو نفاست عطا کی ہے۔ڈاکٹر مناظر عاشق ہر

گانوی لکھتے ہیں ''اطہر نفیس کی غزل میں ذائقہ اور نیا آہنگ ملتا ہے۔ان کے لہجے میں گداختگی ہے، زبان کی سادگی ان کی شاعری کا نمایاں وصف ہے ان کی عصری حسیات نے نئے شاعرانہ وجدان کی تشکیل کی ہے۔احساس کی شکست وریخت سے ان کو حظ ملتا ہے اور اس کی ادائیگی ان کی شاعری کو ایک منفرد آہنگ عطا کرتی ہے۔

اطہر نفیس نے ایک منفرد شاعر کی حیثیت سے ادب میں اپنا مقام بنایا۔اطہر نفیس کو کم وقت ملا اور صرف 47 برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔ان کی زندگی میں تو ان کا شعری مجموعہ شائع نہیں ہوسکا لیکن انتقال کے بعد احمد ندیم قاسمی نے اسے "کلام" کے نام سے شائع کیا۔21 نومبر سن 1980 کو صرف 47 سال کی عمر میں اطہر نفیس کا کراچی میں انتقال ہوگیا اور وہیں سخی حسن قبرستان میں ان کی تدفین ہوئی۔ان کی قبر کے کتبے پر ان کا اپنا شعر کندہ ہے: وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا اب اس کا حال سنائیں کیا..کوئی مہر نہیں، کوئی قہر نہیں، پھر سچا شعر سنائیں کیا۔

عمران خان

سید حسن خان

آج 25 نومبر پاکستان کرکٹ ٹیم کے سابق کپتان، شوکت خانم میموریل ہسپتال کے بانی اور تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان کی سالگرہ ہے۔دنیا کے عظیم کرکٹر کا پورا نام عمران خان نیازی ہے۔عمران خان لاہور میں میں 25 نومبر 1952ء میں اکرام اللہ خان کے گھر پیدا ہوئے۔عمران خان کی پیدائش لاہور کے شہر میں ہوئی۔ آپ پشتونوں کے مشہور قبیلے نیازی سے ہیں عمران خان نے ابتدائی تعلیم لاہور میں کیتھیڈرل اسکول اور ایچیسن کالج، لاہور سے حاصل کی اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ چلے گئے۔وہاں رائل گرائمر اسکول میں پڑھا اور پھر آکسفورڈ یونیورسٹی سے ایم اے سیاسیات کیا۔آپ 1974ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کرکٹ ٹیم کے کپتان بھی رہے۔فرسٹ کلاس کرکٹ کا آغاز 1969–1970ء میں لاہور کی طرف سے سرگودھا کے خلاف کھیلتے ہوئے کیا۔1971ء میں انگلستان کے خلاف پہلا ٹیسٹ میچ کھیلا۔

عمران خان نے 88 ٹیسٹ میچ کھیل کر 362 وکٹیں 81.22 کی اوسط سے حاصل کیں۔1981ء–1982ء میں لاہور میں سری لنکا کے 8 کھلاڑی صرف 58 رنز دے کر آؤٹ کیے۔ اور 23 مرتبہ ایک اننگز میں 5 وکٹیں حاصل کیں۔ انہوں نے 69-36 کی اوسط سے 3807 رنز بنائے جن میں سے 5 سنچریاں بھی شامل ہیں۔ ان کا زیادہ سے زیادہ سکور ایڈی لینڈ میں 1991ء میں آسٹریلیا کے خلاف کھیلتے ہوئے 132 رنز رہا۔ان کا شمار پاکستان کرکٹ کے کامیاب ترین کپتانوں میں ہوتا ہے۔اس اعتبار سے وہ پاکستان کے پہلے کپتان تھے جن کی قیادت میں پاکستانی ٹیم نے بھارت کو بھارت اور انگلستان کو انگریزی سرزمیں میں ہرایا۔ بطور کپتان انھوں نے 48 ٹیسٹ میچ کھیلے جن میں سے 14 جیتے اور 8 ہارے اور 26 برابر یا بغیر کسی نتیجے سے ختم ہوئے۔عمران خان نے مجموعی طور پر 5 عالمی کرکٹ کپ میں حصہ لیا جو کہ 1975ء، 1979ء، 1983ء، 1987ء اور 1992ء میں منعقد ہوئے۔عالمی کرکٹ کپ منعقدہ 1992ء کے بعد بین الاقوامی کرکٹ سے ریٹائرمنٹ لے لی۔ اس کے بعد سماجی کاموں میں حصہ لینا شروع کیا۔آپ نے کینسر کے مریضوں کے لیے ایشیا کا سب سے بڑا ہسپتال شوکت خانم میموریل ہسپتال لاہور ایک ٹرسٹ کے ذریعے قائم کیا۔عمران خان پاکستانیوں کو اس ہسپتال کا بانی قرار دیتے ہیں۔انھیں حکومت پاکستان کی جانب سے صدراتی ایوارڈ بھی ملا۔علاوہ ازیں 1992ء میں انسانی حقوق کا ایشیا ایوارڈ اور ہلال امتیاز (1992ء) میں عطا ہوئے۔ آپ ابھی بریڈفورڈ یونیورسٹی، برطانیہ (University of Bradford) کے چانسلر کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں۔25 اپریل، 1996ء کو تحریک انصاف قائم کرکے سیاسی میدان میں قدم رکھا۔ ابتدائی طور پر انھیں کامیابی نہ مل سکی۔لیکن حالیہ دنوں میں وہ اپنی جدوجہد اور اصول پرستی کی بدولت پاکستانی عوام، خصوصا نوجوانوں میں تیزی سے مقبولیت حاصل کررہے ہیں۔

اُردو کا سفر

مظفر احمد مظفر

''پاکستان اردو نے بنایا'' یہ بیان بابائے اردو نے پاکستان منتقل ہوکر دیا تھا۔ جو لوگ اردو سے واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اردو کا مزاج انسان دوستی اور بھائی چارے کا ہے اردو، مذہبوں، ملتوں، برادریوں، اور فرقوں کے درمیاں ایک مضبوط یک جہتی کے پل کی حیثیت رکھتی ہے۔اردو ہمیشہ سے تنگ نظری منافرت اور علیحدگی کے خلاف رہی ہے۔ یہ یگانت اور انسانیت کی پیامبر ہے، یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ اردو لبرلزم کی ایک مکمل اور مثالی شاخ ہے، یہ شیخ اور برہمن دونوں کو آڑے ہاتھ لیتی ہے۔اس اعتبار سے اردو کا مسلک وہی ہے جو کبیر نانک یا نظام الدین اولیاء کا رہا۔ کوئی وجہ ضرور ہے کہ اشفاق اللہ خان اور اُنکے ساتھی رام پرساد بسمل نے تختہ دار پر اسی زبان کا شعر پڑھتے ہوئے ''لبیک'' کہا تھا اور ''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ بھی اسی زبان کا ہے اردو کشادہ زبان ہے جو ہند آریائی عناصر اور عربی فارسی کے درمیان لسانی اور تحقیقی حسن کاری کا شاندار دریا پُل بناتی ہے اس میں شبہ نہیں کہ ہر زبان اپنی جگہ اہم اور حسین ہے مگر اُردو زبان لسانی تاج محل ہے۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ ہر قوم کا مزاج اور نفسیات مختلف ہوتی ہے، عرب اور ایران کے رہنے والوں کا مزاج اور طرز زندگی یکسر مختلف ہے۔قبول اسلام کے بعد ایرانیوں نے تہذیبی اور لسانی اعتبار سے منفرد رہنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے اور اس

کاوش میں کامیاب بھی ہوئے۔ تاریخ کا ہر قاری جانتا ہے کہ ایرانیوں کی ''شعوبی تحریک'' پوری طرح عرب سے مخالف تحریک تھی اور قدیم ایرانی تہذیب و تمدن کا احیاء اس تحریک کا منفی نتیجہ تھا جو ظاہر ہو کر رہا، مگر کسی بھی شعوبی نے کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ چونکہ عربی اور فارسی رسم الخط سامی الاصل ہیں اور فارسی نے اپنا رسم الخط عربی سے لیا ہے لہذا اسے بدلا جائے۔ مگر بدقسمتی سے برصغیر میں یہ بات جانتے بوجھتے ہوئے تقسیم ہند سے پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتنے جھگڑے نہیں تھے جتنے عربوں اور ایرانیوں میں تھے۔

تقسیم ہند کے بعد بھی مسلمانوں اور ہندوؤں میں معاشی اور معاشرتی اتحاد کی فضا بدستور قائم رہی تھی حالانکہ مذہب وعقیدہ میں بھی نمایاں فرق تھا مگر پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی کے تحت ایسی طرز فکر پیدا کی جارہی ہے جس کے نتیجہ میں 1800ء کے لگ بھگ انگریزوں کی لگائی بجھائی کا نتیجہ سامنے آیا جس کے اثرات آج تک زائل نہ ہو سکے، ایسے وقت میں بعض ہندو گروہوں نے ''دیوناگری'' ناگری پر اصرار کرتے ہوئے فارسی رسم الخط کے ہندوستانی نہ ہونے کا علم بلند کر دیا۔ مذہبی منافرت سے قبل ہی لسانی منافرت کی دیوار اُٹھادی گئی ساور کر نے 1925ء میں چار مضمون لکھے اور یہ سلسلہ بڑھتا گیا اور اس بحث نے اتنا طول پکڑا کہ منشی دیانارائن کے مشہور اخبار ''زمانہ'' جو کہ اردو کا اخبار تھا اُس میں اردو اور اردو رسم الخط کی مخالفت میں مضامین لکھنے شروع کر دیئے، ادھر مسلمانوں میں سے بھی بعض بااثر افراد اردو کی پشت پناہی کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انہیں اردو زبان میں صدائے ''اللہ ہو'' سنائی دینے لگی۔ اور یوں رسم الخط کی بحث کو سیاسی رنگ دے کر انگریز نے فرقہ واریت کا بازار گرم کر دیا۔ آزادی کے بعد سے اردو کو بدیسی کہا جانے لگا۔ اور اس کو ہوا دینے والوں میں گاندھی اور نہرو کے نام لیوا بکثرت تھے دوسری جانب وہ یہ بھی کہتے رہے کہ ہم قومیت اور زبان کو فرقہ واریت کی نظر سے نہیں دیکھتے قول وفعل کے اس تضاد سے جو نتائج نکلے وہ آج سب دیکھ سکتے ہیں کہ ایک کیلئے یہ رسم الخط بدیسی اور دوسرے کے لئے قرآنی قرار پا گئی۔ حالانکہ زبان کی روایت اور لسانی صوتی اصولوں کی روشنی میں یہ دونوں باتیں درست نہیں ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس تنگ نظری کے تناظر سے باہر نکل کر معروضی لسانی بنیادوں پر اردو رسم الخط کے سائنسی نظریہ پر نگاہ ڈالی جائے۔ اور اس کیآزادانہ اور منفرد حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔ اردو ادیبوں کا وہ طبقہ جو اردو رسم الخط کی تبدیلی میں اردو کی بقاوسلامتی کی ضمانت دینے پر بضد ہے اُن کی ہر قدم پر حوصلہ شکنی کی جائے۔ چاہے یہ نعرہ قومی یکجہتی کے نام پر ہی کیوں نہ لگایا جارہا ہو۔ اردو زبان اپنے مخصوص رسم الاخط کے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہے مگر رسم الخط کی تبدیلی سے انفرادیت کے مجروح ہونے کا اندیشہ خطرناک حد تک بڑھ جائے گا۔

ماں کے آٹھ جھوٹ

ڈاکٹر مصطفیٰ اکّاد کی عربی نظم کے ترجمے سے اقتباس

میری ماں نے ہمیشہ حقیقت بیان کی ہو، ایسا بھی نہیں، آٹھ مرتبہ تو اس نے مجھ سے ضرور جھوٹ بولا، یہ قصّہ مری ولادت سے شروع ہوتا ہے، میں اکلوتا بیٹا تھا اور غربت بہت تھی، اتنا کھانا نہیں ہوتا تھا جو ہم سب کو کافی ہو جائے، ایک دن ہمارے گھر کہیں سے چاول آئے، میں بڑے شوق سے کھانے لگا اور وہ کھِلانے لگی، میں نے دیکھا کہ اس نے اپنی پلیٹ کے چاول بھی میری تھالی میں ڈال دیئے، ''بیٹا! یہ چاول تم کھالو مجھے تو بھوک ہی نہیں ہے''۔ یہ اس کا پہلا جھوٹ تھا، اور جب میں قدرے بڑا ہوا تو ایک دن مچھلی پکڑنے گیا، اس چھوٹی سی نہر سے جو ہمارے قصبے سے گذرتی تھی، یوں ہوا کہ دو مچھلیاں میرے ہاتھ لگیں، بھاگا بھاگا گھر آیا اور جب کھانا تیار ہو گیا، دونوں مچھلیاں سامنے تھیں اور میں شوق سے کھا رہا تھا، دیکھا کہ ماں صرف کانٹوں کو چوس رہی تھی، میں نے جب یہ دیکھ کر کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا تو کہنے لگی، ''تمہیں تو پتہ ہی ہے کہ مجھے مچھلی کا گوشت پسند نہیں تم تو کھاؤ''۔ اور یہ اس کا دوسرا جھوٹ تھا۔ اور پھر میرا باپ مر گیا اور وہ بیوہ ہو گئی، اور ہم دونوں گھر میں اکیلے رہ گئے، کچھ دن میرا چچا جو بہت اچھا آدمی تھا، ہمیں کھانا اور ضروریاتِ زندگی لا کر دیتا رہا، ہمارے ہمسائے اسے آتے جاتے غور سے دیکھنے لگے، ایک دن انہوں نے ماں سے کہا؛ زندگی ہمیشہ اس طور پر گذاری نہیں جاسکتی، بہتر ہے کہ تم اس آدمی سے شادی کر لو'' لیکن میری ماں نے چچا کو ہی آنے جانے سے منع کر دیا، ''مجھے کسی ساتھی کی اور کسی کی محبت کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔ یہ اس کا تیسرا جھوٹ تھا۔ اور جب میں کچھ اور بڑا ہوا اور بڑے مدرسے میں جانے لگا، تو میری ماں گھر میں ہر وقت کپڑے سینے لگی، اور یہ کپڑے وہ گھر گھر جا کر بیچتی تھی، سردیوں کی ایک رات تھی اور ماں ابھی تک گھر واپس نہیں آئی تھی، میں تنگ آ کر اُسے ڈھونڈنے باہر نکل پڑا، میں نے اسے کپڑوں کا ایک گٹھڑ اُٹھائے دیکھا، گلیّوں میں گھر گھر دروازے کھٹکھٹا رہی تھی، میں نے کہا؛ ''ماں چلو اب گھر چلو، باقی کام کل کر لینا''۔ کہنے لگی؛ ''تم تو گھر جاؤ، دیکھو کتنی سردی ہے اور بارش بھی ہو رہی ہے، میں یہ دو جوڑے بیچ کر ہی آؤں گی، اور فکر نہ کرو میں بالکل ٹھیک ہوں اور تھکاوٹ بھی نہیں ہے''۔ یہ اس کا چوتھا جھوٹ تھا۔ اور پھر میرا مدرسے میں آخری دن بھی آ گیا، آخری امتحانات تھے، ماں میرے ساتھ مدرسے گئی، میں اندر کمرہ امتحان میں تھا اور وہ باہر دھوپ میں کھڑی تھی۔ بہت دیر بعد میں باہر نکلا، میں بہت خوش تھا۔ ماں نے وہیں سے ایک مشروب کی بوتل خریدی اور میں غٹا غٹ پی گیا۔ میں نے شکر گذار نظروں سے اُسے دیکھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی دھاریں چل رہی تھیں، میں نے بوتل اس کی طرف بڑھا دی، ''پیو ناں ماں''۔ لیکن اس نے کہا؛ تم پیو،

مجھے تو بالکل پیاس نہیں ہے''۔ یہ اس کا پانچواں جھوٹ تھا۔ اور جب میں یونیورسٹی سے فارغ ہوگیا تو ایک نوکری مل گئی، میں نے سوچا کہ اب یہ مناسب وقت ہے کہ ماں کو کچھ آرام دیا جائے، اب اس کی صحت پہلے جیسی نہیں تھی، اسی لئے وہ گھر گھر پھر کر کپڑے نہیں بیچتی تھی، بلکہ بازار میں ہی زمین پر دری بچھا کر کچھ سبزیاں وغیرہ فروخت کرآتی تھی۔ جب میں نے اپنی تنخواہ میں سے کچھ حصہ اُسے دینا چاہا، تو اس نے نرمی سے مجھے منع کر دیا۔ 'بیٹا! ابھی تمہاری تنخواہ تھوڑی ہے، اسے اپنے پاس ہی رکھو جمع کرو، میرا تو گذارہ چل ہی رہا ہے، اتنا کما لیتی ہوں جو مجھے کافی ہوجائے۔'' اور یہ اس کا چھٹا جھوٹ تھا۔ اور جب میں کام کے ساتھ ساتھ مزید پڑھنے لگا اور مزید ڈگریاں لینے لگا، تو میری ترقی بھی ہوگئی، میں جس جرمن کمپنی میں تھا، انہوں نے مجھے اپنے ہیڈ آفس جرمنی میں بلا لیا، اور میری ایک نئی زندگی کی ابتداء ہوئی، میں نے ماں کو فون کیا اور اسے وہاں میرے پاس آنے کو کہا، لیکن اسے پسند نہ آیا کہ مجھ پر بوجھ بنے، کہنے لگی کہ، ''تمہیں تو پتہ ہے کہ میں اس طرزِ زندگی کی عادی نہیں ہوں، میں یہاں پر ہی خوش ہوں۔ اور یہ اس کا ساتواں جھوٹ تھا۔ اور پھر وہ بہت بوڑھی ہوگئی۔ ایک دن مجھے پتہ چلا کہ اس کو جان لیوا سرطان ہوگیا ہے، مجھے اس کے پاس ہونا چاہئے تھا، لیکن ہمارے درمیاں مسافتیں حائل تھیں، پھر جب اسے ہسپتال پہنچا دیا گیا تو مجھ سے رہا نہ گیا، میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کے پاس وطن واپس آ گیا، وہ بستر پر تھی، مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک مُسکان آ گئی، مجھے اسے دیکھ کر ایک دھچکہ سا لگا اور دل جلنے لگا، بہت کمزور بہت بیمار لگ رہی تھی، یہ وہ نہیں تھی، جس کو میں جانتا تھا، میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، لیکن ماں نے مجھے ٹھیک سے رونے بھی نہیں دیا، میری خاطر پھر مسکرانے لگی، ''نہ رو میرے بیٹے، مجھے بالکل کوئی درد نہیں محسوس ہو رہا'' اور یہ اس کا آٹھواں جھوٹ تھا۔ اس کے بعد اس نے آنکھیں موند لیں، جو اس کے بعد پھر دوبارہ کبھی نہیں کھلیں۔

جستہ جستہ - عاصی صحرائی

نفرتوں کا اثر دیکھو جانوروں کا بٹوارہ ہوگیا۔ گائے ہندو ہوگئی اور بکرا مسلمان ہو گیا، سوکھے میوے بھی دیکھ کر حیران ہوگئے، نا جانے ناریل کب ہندو اور کھجور مسلمان ہوگئی، جس طرح سے دھرم، مذہب کے نام پر ہم رنگوں کو بھی بانٹتے جا رہے ہیں کہ ہرا رنگ مسلم ہے اور لال ہندو، تو وہ دن دُور نہیں جب ساری کی ساری ہری سبزیاں مسلمانوں کی ہو جائینگی اور ہندوؤں کے حصے میں بس ٹماٹر اور گاجریں ہی آئیں گے۔ اب یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ یہ تربوز کس کے حصے میں آئے گا؟ یہ تو بے چارہ اُوپر سے مسلمان اور اندر سے ہندو ہی رہ جائے گا...

بروقت فیصلہ کرنے سے کامیابی ملتی ہے

عامر سہیل

کسی برتن میں پانی لیں اور اس میں ایک مینڈک بھی ڈال دیں۔ اور پانی کو گرم کرنا بھی شروع کر دیں۔ جیسے جیسے پانی کا درجہ حرارت بڑھنا شروع ہوگا۔ مینڈک اپنے جسم کا درجہ حرارت بھی بڑھانا شروع کر دے گا۔ اور اپنے آپ کو اس پانی میں رہنے کے لئے ایڈجسٹ کر لے گا۔ ایک وقت آئے کہ کہ پانی اُبلنے لگے گا۔ تو مینڈک اپنے آپ کو ایڈجسٹ نہیں کر سکے گا۔ اور پانی سے باہر جمپ کرنے کی کوشش کرے گا لیکن وہ ایسا نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ وہ اپنی ساری توانائی پہلے ہی ضائع کر چکا ہے۔ اور جلد ہی مر جائے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مینڈک کو کس نے مارا۔ بہت لوگوں کا جواب ہوگا، اُبلتے ہوئے پانی نے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُسے اس کے غلط فیصلے اور سوچ نے مارا۔ وہ فیصلہ بروقت نہ کر پایا کہ جمپ کس وقت کرنا ہے۔ ہمیں اپنی روزمرہ زندگی میں ایسی ہی کئی صورت حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہمیں بروقت بہتر ایکشن لینا چاہیئے۔ اگر ہم نے وقت ضرورت بروقت بہتر فیصلہ نہ کیا تو ہمارا استحصال ہوتا رہے گا۔

دنیا

ایک روز ہم ڈیرے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے بابا جی سے پوچھا کہ جناب دنیا اتنی خراب اور اس قدر مادہ پرست کیوں ہوگئی ہے۔ بابا جی نے جواب دیا۔'' دنیا بہت اچھی ہے'' جب ہم تنگ نظری سے اس پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ تنگ نظر دکھائی دیتی ہے۔ جب ہم اس پر کمینگی سے نظر دوڑاتے ہیں تو یہ کمینی نظر آتی ہے۔ جب ہم اسے خودغرضی سے دیکھتے ہیں تو یہ خودغرض ہوجاتی ہے۔ لیکن جب ہم اس پر کھلے دل، روشن آنکھ، اور محبت بھری نگاہ سے نظر دوڑاتے ہیں۔ تو پھر اسی دنیا میں ہمیں کیسے پیارے پیارے لوگ نظر آنے لگتے ہیں۔'' (اشفاق احمد زاویہ 3 ص 227)

زندوں کی تذلیل مردوں کا احترام کرنے والا معاشرہ

نامور شاعر و ادیب منیر نیازی ایک مرتبہ رکشے میں جا رہے تھے کہ اچانک رکشہ رُک گیا۔ انہوں نے رکشہ ڈرائیور سے پوچھا۔'' کیا معاملہ ہے'' جواب ملا کہ جنازہ گزر رہا ہے۔ منیر نیازی جو جملہ سازی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے بولے۔'' ظالمو! تم بھی کیا لوگ ہو، زندہ انسان کو کچل کر گزر جاتے ہو اور جنازے کے احترام میں رکشا روک لیتے ہو''۔

مطلبی رشتہ

مطلبی رشتہ کوئلے کی طرح ہوتا ہے۔ جب گرم ہوتا ہے تو ہاتھ جلا دیتا ہے اور جب ٹھنڈا ہوتا ہے تو ہاتھ کالے کرتا ہے۔

شذرات۔اخبارات ورسائل کے فکرانگیز اقتباسات

مکرم شاہد احمد چیمہ صاحب۔میری فریاد

جناب عبدالرؤف اپنے کالم میں لکھتے ہیں:

دودھ میں پانی ،شہد میں شیرہ ،امتحانات میں نقل ،ناپ تول میں کمی ،دوستی میں خودغرضی ،ایمان میں منافقت ،رشتوں میں اذیّت ،ہلدی میں مصنوعی رنگ ،مرچ میں سرخ اینٹیں ،نوکری میں سفارش ورشوت ،ہوٹلوں میں مردار کا گوشت ،بجلی میں ہیرا پھیری ،ٹیکس کی ادائیگی میں چوری ،عبادت میں ریاکاری.....اور کہتے ہیں حکمران ٹھیک نہیں۔''اللہ ہو'' کون بچائے گا ایسے میں۔اگر گوشت کے نام پر گدھوں کا گوشت ملے،اگر دودھ کے نام پر کپڑے دھونے کے پاؤڈر کی آمیزشسے بنا محلول ملے،اگر ریاکاری عام ہو،اگر ہوس نے ہر طرف ڈیرہ کیا ہو تو انسان کہاں ملے گا اور میں اس میں نیک و پارسا حکمران تلاش کررہا ہوں۔(روزنامہ جنگ 9 اگست 2015ء)

اُم السانحات

جناب سلیم صافی صاحب اپنے کالم میں لکھتے ہیں:

قصور میں بے قصور بچوں کے ساتھ زیادتی سانحہ بلکہ اُم السانحات ہے۔سانحہ تو آرمی پبلک سکول پشاور کا بھی بہت بڑا اور سنگین ترین تھا لیکن وہ شقی القلب یا وحشت کا اظہار تھا جبکہ قصور کا سانحہ تو کئی حوالوں سے ہمارے معاشرے کے اس گندے چہرے سے نقاب اُتارتا ہے۔پشاور میں ایک سو سے زائد بچوں کی زندگیوں کا خاتمہ کرکے اُنہیں جنت میں بھیج دیا گیا اور شاید وہ اپنے دکھی والدین کی شفاعت کا ذریعہ بھی بن جائیں لیکن قصور میں تو ڈھائی سو سے زائد بچوں کو زندہ درگور کرکے جہنم میں بھیج دیا گیا اور ان کے ماں باپ اور بہن بھائیوں کیلئے بھی جینا حرام کردیا گیا۔پشاور کے شہداء کے والدین تو زندگی بھر فخر سے جئیں گے لیکن ان کی آئندہ نسلیں بھی فخر کریں گی کہ وہ معصوم شہداء کے ورثا ہیں لیکن قصور کے بچوں کے اہل خانہ تو زندگی بھر کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہے۔سانحہ پشاور کے ذمہ دار وحشیوں نے تو صرف سانسیں چھین لی تھیں لیکن قصور کے درندوں نے تو عزتیں بھی چھین لیں۔سانحہ پشاور کے فوٹو دکھا کر ہم اپنے دکھوں کو ہلکا کرسکتے ہیں اور ان کی تصاویر سینوں سے لگا کر،ان کی یاد میں رو سکتے ہیں لیکن قصور کے بے قصور متاثرین کا تو ہم نام لے سکتے ہیں ،تصویر دکھا سکتے ہیں اور نہ ان کی یاد میں کسی تقریب کا اہتمام کرسکتے ہیں۔قصور کا سانحہ وحشت کے اوپر وحشت ہے۔پہلی وحشت بدفعلی کی۔دوسری وحشت بچوں کے ساتھ، تیسری وحشت اس کی فلم بنانے کے۔چوتھی وحشت اس کے ذریعے ان کو بلیک میل کرنے کی ،پانچویں وحشت اس سے ان کے اہل خانہ کو ستانے کی۔چھٹی وحشت اس کے ذریعے پیسہ کمانے کی۔ساتویں وحشت اس کو دنیا میں پھیلانیکی۔آٹھویں وحشت یہ ظلم اور وہ بھی اپنے گاؤں کے بچوں کے ساتھ۔نویں وحشت غریب اور لاچار لوگوں کے ساتھ۔دسویں وحشت دنیا بھر میں پاکستان کا چہرہ کالا کرنے کی۔علی ھذا القیاس۔یہ صرف شقی القلب نہیں۔بے غیرتی ،بے شرمی ،بے حسی ،درندگی ،خودغرضی ،حرص ،لالچ ،غرض ہر غیظ اور قبیح عمل اور سچ کی انتہا ہے۔ان کے صرف حلیے انسانوں کے ہیں لیکن یہ کسی بھی پیمانے پر انسان کہلانے کے نہیں۔یہی لوگ ہیں جنہیں قرآن نے فسادفی الارض کے مجرم گردانا ہے۔یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے سنگسار جیسی سنگین سزائیں تجویز کی گئی ہیں۔میں حیران ہوں کہ اس اُم السانحات کے سامنے آنے کے بعد قیامت برپا کیوں نہیں ہوئی؟اے پی سی کیوں نہیں بلائی گئی؟اس قوم کے اخلاقی زوال کے پیش نظر اور اس قسم کے درندہ صفتوں کے تدارک کیلئے قومی ایکشن پلان کیوں نہیں بنایا گیا؟قصور کے بے قصور بچوں کو اپنی ہوس اور درندگی کا نشانہ بنانیوالے مجرموں کے جرم کے کس کس پہلو اور کس کس سنگینی کا ذکر کروں۔وہ پاکستان میں پنجاب کی بدنامی اور دنیا میں پاکستان کی رسوائی کا ذریعہ بنے۔دنیا کے لوگ کہیں گے کہ یہ وہ اسلام کا قلعہ ہے جس میں معصوم بچوں کے ساتھ اس ملک کے درندوں کے ہاتھوں ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔لیکن اس واقعے نے ہم سب کے بھیانک چہروں سے نقاب اتار دیا..... پاکستانی معاشرہ آج جس اخلاقی انحطاط کا شکار ہے،اس کی دنیا میں کہیں اور مثال نہیں ملتی۔اخلاقیات عبادات میں ہم شاید بہت آگے ہیں لیکن کا یہاں سے جنازہ نکل گیا ہے۔منافقت نے ہمارے معاشرے کو غلاظتوں سے بھر دیا ہے۔لیکن افسوس کہ اس طرف توجہ دینے والا کوئی نہیں۔معاشرے کے اخلاق استاد سدھارتا ہے لیکن اسے اپنے روزگار،پروموشن اور ٹرانسفر کے عذابوں میں مبتلا کردیا گیا ہے۔علماء کی ذمہ داری ہوتی ہے لیکن وہ سیاست میں مصروف ہیں یا پھر فرقہ واریت پھیلا رہے ہیں۔بعض مساجد میں جمعے کا خطبہ بھی شیخ رشید احمد کی تقریر دکھائی دیتا ہے۔اسی طرح سیاسی لیڈر اعلیٰ اخلاقی معیارات کا نمونہ بن کر قوم کی اخلاقی تربیت کرتا ہے لیکن یہاں کے سیاسی لیڈر ماشاء اللہ ہمیں ایک ایکشن پلان کی ضرورت ہے۔ ایسا ایکشن پلان جو ایک نئے سوشل کنٹریکٹ کا راستہ ہموار کرے۔جو عبادات کے ساتھ ساتھ ہمیں اخلاقیات کی طرف بھی متوجہ کرے۔جو اس معاشرے سے منافقت اور خودغرضی کے کینسر کو دور کرنے کیلئے لائحہ عمل تجویز کرے۔جو ہمیں دوسروں کی ذات میں کیڑے نکالنے کی بجائے اپنے گریبانوں میں جھانکنے کا سلیقہ سکھائے۔جو ہمیں دوسروں کے گھروں میں ٹانگ اڑانے سے باز رکھ کر اپنے گھر کی بدحالی کی طرف متوجہ کرے۔

(روزنامہ جنگ 11 اگست 2015ء)

شرمائیں یہود

شکیل فاروقی لکھتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ جب جیب تراشی کے واقعات اکادکا سننے میں آتے تھے اور وہ بھی میلوں ٹھیلوں اور بڑے بڑے اجتماعات میں۔مگر اب تو یہ وبا اس قدر عام ہوچکی ہے کہ الامان والحفیظ۔شادی بیاہ کے اجتماعات میں تو جیب تراشی روزمرہ کا معمول بن گئی ہے۔جس کے باعث خوشی کا یہ ساماں ذرا دیر میں سوگ کی محفل میں تبدیل ہوجاتا ہے۔یہ ہمارے معاشرے کی اخلاقی پستی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔افسوس صد افسوس کہ ہم اخلاقی طور پر اتنے گر چکے ہیں کہ ہمارے یہاں جنازوں تک میں بھی جیب تراشی کے واقعات پیش آرہے ہیں۔اپنے معاشرے کی اخلاقی پستی پر جتنا بھی ماتم کیا جائے وہ کم ہے۔لوگوں کے دلوں سے خوفِ خدا اب اس حد تک ختم ہوچکا ہے کہ مساجد میں جوتے چرانے کی وارداتوں میں روز بہ روز اضافہ ہی ہورہا ہے۔جس کی وجہ سے بیچارے نمازی نہ صرف اپنے جوتے اپنے ساتھ لے جانے بلکہ اپنی اگلی جانب رکھنے پر بھی مجبور ہوچکے ہیں۔اس پر ہمیں اپنے ایک دوست سے ایک غیر مسلم کی جانب سے پوچھا جانے والا یہ معصومانہ سوال یاد آرہا ہے کہ ''کیا آپ لوگ مسجد میں جوتوں کی پوجا کرتے ہیں ؟'' بلاشبہ مساجد خانہ خدا ہیں اور ان کا احترام ہر مسلمان پر فرض ہے۔اب اگر کوئی خانہ خدا میں جوتا چرانے کی حرکت کرے تو اسے آپ کیا کہیے گا عام مساجد تو درکنار، نام نہاد مسلمانوں کی اخلاقی پستی کا عالم اس سے بڑھ کر بھلا اور کیا ہوسکتا ہے کہ خانہ کعبہ جیسی مقدس ترین جگہ پر بھی جیب تراشی کے واقعات پیش آرہے ہیں۔اقبال کے الفاظ میں ایسی صورتحال کے بارے میں اس کے سوائے اب اور کیا کہا جاسکتا ہے۔یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود۔

(روزنامہ ایکسپریس 8 ستمبر 2015ء)

جواب آں غزل

مذکورہ بالا عنوان کے تحت جناب محمد صدیق قادری صاحب لکھتے ہیں۔

مورخہ 27 ستمبر کو روزنامہ اوصاف میں حافظ محمد افضل صاحب کا مضمون ''قیام پاکستان اور علمائے دیوبند'' پڑھنے کا اتفاق ہوا۔موصوف کے خیال میں مولانا حسین احمد مدنی ،مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری وغیرہ کی تحریک پاکستان کی مخالفت کی اصل وجہ قائداعظم اور ان کے رفقاء میں خطہ زمین حاصل کرنے کے بعد اس میں اسلامی نظام قائم کرنے کیلئے مطلوبہ اہلیت کا فقدان تھا۔ان میں جرأت ،تقویٰ و پرہیزگاری ،علم وفضل ،فہم وفراست عقیدہ وعمل ،تقویٰ وطہارت ،عزیمت اور ایثار وقربانی ناپید تھی۔حیرت ہے کہ نصف صدی سے زائد گزر جانے کے باوجود موصوف آج بھی اپنے اکابرین کی غلط فیصلوں کو درست ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔اسے ''عذر گناہ بدتر از گناہ'' سے ہی تعبیر کیا جاسکتا ہے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ان میں مذکورہ صفات موجود نہ تھیں تو موصوف کے اکابرین کو یہ حق کیسے تفویض ہوسکتا تھا کہ وہ ہندو کانگریس کی ہمنوائی کرتے ہوئے متحدہ قومیت کو اپنا کر مسلم قومیت کا انکار کرتے۔مسٹر گاندھی کو جامع شیخ خیرالدین امرتسر میں لاکر منبر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بٹھاتے۔خود اس کے قدموں میں بیٹھ کر یہ دعا کرتے کہ ایا اللہ تو گاندھی کے ذریعے اسلام کی مدد فرما۔ (حوالہ تحریک آزادی ہند اور سواد اعظم)

دسمبر 1920ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی دسمبر کوششوں سے قائم ہونے والے مدرسہ اسلامیہ کلکتہ میں صدر مدرس مولانا حسین احمد مدنی مقرر ہوئے جس کی رسم افتتاح مسٹر گاندھی نے کی۔اس واقعہ پر مسلمانوں کے علاوہ ہندو بڑی تعداد میں موجود تھے۔

(بحوالہ مکاتیب ابوالکلام آزاد مرتبہ ابوسلمان شاہ جہانپوری مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ)

رسالہ الناظر کے ایڈیٹر مولانا ظفر الملک نے کہا کہ اگر نبوت ختم نہ ہوگئی ہوتی تو مہاتما گاندھی نبی ہوتے۔مولانا شوکت علی نے فرمایا زبان سے پکارنے سے کچھ نہیں ہوتا تم ہندو بھائیوں کو راضی کروگے تو خدا راضی ہوگا۔ان لیڈروں نے اس پر بس نہ کی بلکہ بقول ایک سابق مرکزی وزیر خان عبدالوحید خان جامع مسجد دہلی کے منبر پر شردھانند سے تقریریں کرائی گئیں۔ایک ڈولی میں قرآن پاک اور گیتا کو رکھ کر جلوس نکالے گئے۔مسلمانوں نے کچھ کے لگائے۔گاندھی جی کی تصویروں اور بتوں کو گھروں میں آویزاں کیا گیا۔حضرت موسیٰ کو کرشن کا خطاب دیا گیا۔ویدکو الہامی کتاب تسلیم کیا گیا،گائے کی قربانی کی ممانعت کے فتوے اونٹوں کی پشت پر سے تقسیم کئے گئے۔علماء کے اس طبقہ سے کانگریس سے الگ احرار کے نام سے بھی ایک تنظیم بنائی جس نے گانگریس سے بڑھ کر کانگریس کے مفاد میں کام کیا۔پنڈت نہرو،سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی سحر بیانی کے عاشق تھے۔گاندھی ارون پیکٹ کے بعد احرار رہنما جب بھی گاندھی سے ملنے گئے وہ اُٹھ کر دروازے تک انہیں لینے آئے۔یہ وہ امتیازی عمل تھا جو گاندھی نے ذندگی میں صرف احرار رہنماؤں کی عزت وتکریم کے لئے کیا۔

(بحوالہ اعلیٰ حضرات کی سیاسی بصیرت،مطبوعہ،گجرات،تحریک پاکستان ونیشنلسٹ علماء)

(روزنامہ اوصاف اسلام آباد 9 اکتوبر 2000ء)

بگڑی بنے تو کیسے؟

جناب چوہدری رحمت علی صاحب اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''اس کائنات کے رب نے اُمت مسلمہ کو ''امت خیر'' کے عظیم لقب سے موسوم کیا ہے۔لیکن سوختہ بختی ،واقعات کی دنیا میں زیر آسمان آج جتنی اُمت مسلمہ مغلوب ومجبور ہے شاید ہی اتنی دنیا کی کوئی دوسری قوم ہو۔دھرتی کے سینے پر آج جہاں کہیں

جنگ ہورہی ہے، اکثر و بیشتر مسلم سرزمینیں ہیں۔ارزانی ہے تو خون مسلم کی اور ویرانی ہے تو عصمت مسلم کی۔سلامتی کونسل میں پانچ ممالک مستقل رکنیت اور ویٹو پاور کے حامل ہیں۔ چراغ لیکر ڈھونڈیں ان میں کوئی ایک بھی مسلمان ملک نہیں۔حالانکہ یو این او میں تقریباً ایک تہائی تعداد مسلمان ممالک کی ہے۔عالمی کرنسی ڈالر، پونڈ، ین وغیرہ ہے تو عالمی زبان انگریزی۔کسی مسلمان کرنسی اور کسی مسلمان زبان کو عالمی ہونے کا اعزاز حاصل نہیں۔عالمی مالیاتی نظام پر یہود و نصاریٰ کی گرفت ہے۔ نیو ورلڈ آرڈر، ورلڈ بینک، آئی ایم ایف وغیرہ جیسے پھندوں نے پھانس رکھا ہے تو زیادہ تر مسلمان ممالک کو۔تمام مسلم ممالک کا تیسری دنیا کے ممالک میں شمار ہوتا ہے۔تیسری دنیا کا ذکر بھی دبی زبان میں ہوتا ہے ورنہ کہنے والوں کا اصل مطلب ''تیسرے درجہ کی دنیا'' ہوتا ہے۔ذلت و رسوائی کی انتہا کہ مسلمان ممالک ایک دوسرے کی مدد تو کیا ایک دوسرے کے حق میں زبان کھولتے ڈرتے عہیں۔بقول شاعر کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغ بے نیام...اصل میں ہمارا ہر رنگ داغدار، ہر رنگ منتشر اور ہمارے ہر رنگ میں بھنگ ہے۔تبھی تو ہمارے یہاں اتحاد کی بجائے انتشار، امن کی بجائے دہشت گردی ،عدل کی بجائے ظلم، خوشحالی کی بجائے پسماندگی و درماندگی اور سب سے بڑھ کر عالمی سطح پر کفر کی بالادستی اور ہماری مغلوبیت ایسے میں...بگڑی بن جائیگی تو کیسے؟

(روزنامہ انصاف لاہور اکتوبر 2000ء)

نکاح ٹوٹ گئے

جناب اثر چوہان صاحب اپنے ایک کالم میں لکھتے ہیں:

'قیام پاکستان سے پہلے پنجاب کے ایک گاؤں میں ایک مولوی صاحب گاؤں کے ہندو بنیے سے کسی بات پر ناراض ہوگئے تو انہوں نے جمعہ کے خطبے سے پہلے اعلان کیا کہ مکند لعل وہابی ہوگیا ہے لہٰذا کوئی مسلمان اس کی دکان سے سودا نہ خریدے۔ مسلمانوں نے مکند لعل کی دکان کا بائیکاٹ کر دیا تو اس کی دکان ٹھپ ہوگئی۔چنانچہ ایک رات وہ رات کے اندھیرے میں مولوی صاحب کے حضور حاضر ہوا۔معافی مانگی تو اگلے جمعہ مولوی صاحب نے فتویٰ واپس لے لیا۔مکند لعل کی دکان پر پھر رونق ہونے لگی۔اس دوران کسی بھی مسلمان نے اس نکتے پر غور نہیں کیا کہ کوئی بھی ہندو ''وہابی'' کیسے ہوسکتا ہے۔تحریک پاکستان کے دنوں میں بعض علماء حضرات نے اس طرز کے فتوے بھی دیئے تھے جو کوئی آل انڈیا مسلم لیگ کا ساتھ دے گا یا اس کے امیدوار کو ووٹ دے گا اس کا نکاح ٹوٹ جائے گا اور اس کی بیوی اس پر حرام ہوجائیگی۔1970ء کے عام انتخابات سے قبل 13 علماء نے ذوالفقار علی بھٹو کے اقتصادی پروگرام سوشلزم یا اسلامی سوشلزم کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا لیکن مغربی پاکستان نے بھٹو کی پیپلز پارٹی کو سب سے زیادہ ووٹ دیئے۔1970ء میں امریکی قونصل جنرل لاہور کی دعوت افطار میں کچھ سیاستدان شریک ہوئے تو ایک مسلکی علماء نے فتویٰ دیا کہ جن لوگوں نے مسٹر رچرڈ میکی کی دعوت افطار میں شرکت کی ہے ان کے نکاح ٹوٹ گئے دعوت افطار میں مولانا الستار خان نیازی بھی موجود تھے، لوگ حیران تھے مولانا کا تو نکاح نہیں ہوا تو ٹوٹیگا کیسے؟...1970ء میں کراچی کے ایک دارالعلوم کے علماء نے فتویٰ دیا ''بھارتی فلموں کے فلاں فلاں گانے سننا اور انہیں گنگنانا کفر ہے ان گانوں کو سننے اور گنگنانے والا دائرہ اسلام سے خارج ہوجائے گا اور اس کا نکاح ٹوٹ جائے گا۔حال میں ایک ''عالم دین'' نے فتویٰ دیا ہے مختلف این جی اوز کی رکن خواتین سے کوئی بھی مسلمان زبردستی نکاح کرسکتا ہے۔جس کا پڑھے طبقوں میں شدید ردعمل ہوا۔بعض علماء کے اس طرح کے رویے سے بین الاقوامی سطح پر اسلام دشمنوں کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پراپیگنڈا کرنے کا موقع ملتا ہے''۔

(روزنامہ پاکستان لاہور 7 اکتوبر 2000ء)

صورت حالات ''شاعر لاہور''

محترم جناب ثاقب زیروی صاحب ملکی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

لاوا پک رہا ہے دلوں میں نفاق کا
ہر سمت چل رہی ہوا انتشار کی
سانسوں میں بھی حرارت آلات جنگ ہی
شعلے اُگل رہی ہیں ہوائیں بہار کی

(ہفت روزہ ''لاہور'' 21 اکتوبر 2000ء صفحہ 14)

منزل مقصود سے دُوری

حکیم محمد سعید لکھتے ہیں۔

'ایک وقت تھا مسلمان معلم اخلاق سمجھے جاتے تھے۔وہ دنیا بھر کے لوگوں کو نیک کاموں کی تربیت دے کر ان کے اخلاقی معیار کو کرتے تھے۔اس طرح خود ان کا اخلاق ضرب المثل ہوگیا تھا۔مگر آج ہماری بداخلاقی ضرب المثل ہوگئی ہے۔لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے مسلمانوں کو ان کے اس مقام کی یاد دلائی جائے جسے انہوں نے اپنی نادانی سے ترک کر دیا ہے اور ترغیب دی جائے اس منزل مقصود کو دوبارہ حاصل کریں۔

لا پھر اک بار وہ بادہ وجام اے ساقی
یاد آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی

(سوئٹزرلینڈ میں میرے چند شب و روز صفحہ 183 حکیم محمد سعید ناشر ہمدرد اکیڈمی کراچی)

سیاسی تحریک

روزنامہ خبریں کو جسٹس (ر) جاوید اقبال کے انٹرویو سے اقتباس۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا افسوس اس بات کا ہے ہم میں نفرت کیوں ہے۔ہم یہ کیوں کہتے ہیں فلاں سکھ ہے،عیسائی ہے یا ہندو۔ہم مسلمانوں کے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔شیعہ کو قتل کر رہا ہے اور شیعہ کو۔مساجد میں خون بہہ رہا ہے۔میں تو کہتا ہوں احمدیوں کو بھی کافر قرار نہیں دینا چاہا تھا۔احمدیوں کو کافر قرار دیا تو انتہا پسندی کو شہہ ملی وہ مزید مضبوط ہوئے۔اس کا مطلب ہے احمدیوں کو کافر قرار دینا مذہبی معاملہ نہیں تھا؟ بالکل نہیں۔یہ ایک سیاسی تحریک تھی اور جو بھٹو نے اس کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔بھٹو نے اس بات کو بھی سامنے نہیں رکھا اسے احمدیوں نے بحیثیت جماعت ووٹ دیئے تھے میرے حلقے میں موجود تمام احمدیوں نے مجھے ووٹ نہیں دیئے بلکہ بھٹو کو ووٹ دیا۔جب وہ برسر اقتدار آیا تو اسنے احمدیوں کو مولویوں کے دباؤ پر کافر قرار دے دیا۔اقتدار میں رہنے کیلئے اس نے مولویوں کے مطالبات کو تسلیم کرنا شروع کر دیا۔جمعہ کی،شراب پر پابندی اور احمدیوں کو کافر دلوانا سب اسی دباؤ کے تحت کئے گئے فیصلے تھے لیکن مولوی نہیں مانے اور انہوں نے کہا یہ ملک اسلام کے نام پر بنا ہے اور اس کا فائدہ ضیاء الحق نے اٹھایا اور اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ایک بھی احمدی ایسا نہیں تھا جس نے بھٹو اور پیپلز پارٹی کو ووٹ نہیں دیا تھا۔ہم تو اس وقت ان کیخلاف الیکشن لڑ رہے تھے۔ (خبریں۔سنڈے میگزین 13 اگست 2006ء)

نوسر بازیاں

جناب سعد اللہ جان برق صاحب ایک قاری کے خط کے جواب میں جس نے تاج کمپنی میں رقم جمع کروائی تھی لکھتے ہیں:

''دنیاوی معاملات میں نوسر بازی تو چلتی رہتی ہے لیکن اب دین کے مقدس نام پر جو نوسر بازیاں بہت بڑے پیمانے پر چل رہیں۔اسے دیکھ کر ہم جیسے کم علم اور دنیاد ارتو دم بخود رہ جاتے ہیں لیکن بزرگان دین جیسا حلیہ بنا کر خدا اور رسول کے نام پر لوٹنے والوں کے کانوں پر ذرا بھر جوں نہیں رینگتی پورے دین کو ڈکار جاتے ہیں،قرآن کو ڈکار جاتے ہیں حتیٰ خدا اور رسول کے مقدس نام تک ڈکار لیتے ہیں لیکن بڑے آرام سے اپنی توندوں پر ہاتھ پھیر کر الحمدللہ الحمدللہ کرتے رہتے ہیں۔

نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے دین کی اشاعت،جہاد، مدرسوں، قرآن اور مسجد کے نام پر یہ لوگ وہ وہ کچھ کر جاتے ہیں اگر کافر کو بھی کرنا پڑے تو وہ سو بار سوچ کر کرے گا بلکہ ہمارا خیال ہے کافر وہ کام کر نہیں سکتے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔اشاعت دین کے نام پر ذرا بازار میں پڑی ہوئی کتابوں کا جائزہ لیجئے طرح طرح اور بھانت بھانت کی کتابیں اور غلط ملط چھاپ کر ذہنوں کو پراگندہ کیا جا رہا ہے۔کبھی کبھی تو ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو لوگ خدا،رسول،قرآن اور دین کے نام پر فراڈ کرتے ہیں یہ دراصل مسلمان ہوتے نہیں۔کیا یہ ممکن ہے میں خدا پر یقین بھی رکھوں پانچ وقت اس کے سامنے حاضری بھی دوں اور بیچ بیچ میں اسی خدا کے نام پر فراڈ اور حرام خوری بھی کروں اگر میں خدا کو مانتا ہوں اور پانچ وقت اس کے سامنے حاضری بھی دوں تو یہ ممکن نہیں میں اس کے حکم کی ذرہ بھر بھی خلاف ورزی کروں۔کیا مجھے ذرہ بھر بھی شرم نہیں آئیگی صبح اس کے سامنے پیش ہو کر اس کے ساتھ وعدہ وعید کروں پھر ظہر تک انسانوں کو ذبح کرتا رہوں اور پھر اس کے سامنے اسی آلودہ ہاتھوں اور چہرے کے ساتھ پیش ہو جاؤں ہمارا تو آپ کو مشورہ ہے اپنی ساری امیدیں توڑ دیں کیونکہ دراصل یہ سارے ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔کوئی کیا بیچ رہا ہے اور کوئی کیا اور کسی مسبب الاسباب سے رجوع کیجئے جس نے ان لوگوں کی رسی نہ جانے کیوں دراز کر رکھی ہے۔

(روزنامہ ''ایکسپریس'' فیصل آباد 9 جون 2003ء)

مولانا مودودی خادمِ اسلام یا انتہا پسند؟

وسعت اللہ خان (بی بی سی اردو ڈاٹ کام،کراچی،9 دسمبر 2015)

انیس سو اناسی میں جب کنگ فیصل فاؤنڈیشن نے سائنس، مذہب، فلسفے اور خدمات کے شعبوں میں اسلامی دنیا کے نوبیل پرائز کنگ فیصل ایوارڈ کا اجرا کیا تو خدمتِ اسلام کے شعبے میں پہلا فیصل ایوارڈ (چوبیس قیراط دوسو گرام کا طلائی تمغہ مع دو لاکھ ڈالر) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو دیا گیا۔اگر آپ کنگ فیصل فاؤنڈیشن کی ویب سائٹ کھولیں تو آج بھی مولانا مودودی کا تعارف کچھ یوں ہے۔''وہ معروف مذہبی سکالر اور مبلغِ اسلام تھے۔ان کا شمار بیسویں صدی کے صفِ اول کے موثر اسلامی فلسفیوں میں ہوتا ہے۔ان کی زندگی اور نظریات کو دنیا بھر میں مسلمان اور غیر مسلم محققین نے اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔وہ ایک وسیع العلم شخصیت تھے جن کی تحریروں نے عالمِ اسلام میں اسلامی اقدار اور روحِ اسلام کو اجاگر کیا۔انھیں کنگ فیصل ایوارڈ اسلامی صحافت کے فروغ اور برصغیر میں اسلامی نظریات کے احیاء کے اعتراف میں عطا کیا گیا۔''مولانا مودودی کے بعد خدمتِ اسلام کے شعبے میں کنگ فیصل ایوارڈ شاہ خالد اور پھر شاہ فہد بن عبدالعزیز کو بھی دیا گیا اور یہی ایوارڈ مولانا مودودی کو ملنے کے گیارہ برس بعد (1990) ان کے شاگرد پروفیسر خورشید احمد کو بھی عطا ہوا۔اور پھر دو دسمبر 2015 کو سعودی اخبار عرب نیوز میں یہ خبر شائع ہوئی کہ سعودی وزارتِ تعلیم نے اخوان المسلمون کے بانی حسن البنا،سید محمد قطب،قطر کے عالم یوسف القرادوی اور مولانا مودودی کی تصنیفات سمیت

80 کتابوں پر پابندی عائد کردی ہے۔تمام سعودی سکولوں، لائبریریوں اور ریسورس سینٹرز کو حکم دیا گیا ہے کہ دو ہفتے کے اندر ان مصنفین کی کتابیں وزراتِ تعلیم میں جمع کرا دیں ورنہ تادیبی کاروائی ہوگی۔ نیز خبردار کیا گیا کہ آئندہ کوئی سکول، لائبریری اور ریسورس سینٹر سوائے وزارتِ تعلیم کسی اور سے کتابوں کا عطیہ یا تحائف قبول نہ کرے۔گو ان تصنیفات کو ممنوع قرار دینے کی سرکاری وجہ تو نہیں بتائی گئی البتہ وزارتِ تعلیم کے اندرونی ذرائع کے مطابق یہ فیصلہ سعودی عرب میں دہشت گردی اور انتہا پسندی ابھارنے والے لٹریچر کے خلاف مہم کا حصہ ہے۔مولانا مودودی کی جن 20 کتابوں اور کتابچوں کو ممنوع قرار دیا گیا ان میں پردہ، اسلام اور جاہلیت، تفسیر سورہِ نور، شہادتِ حق، اسلامی دستور کی تدوین، اسلامی نظامِ زندگی اور اس کے بنیادی تصورات، مبادیِ اسلام، معاشیاتِ اسلام، قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں اور قرآن فہمی کے بنیادی اصول نامی کتابیں بھی شامل ہے۔جولائی 2010 میں بنگلہ دیش میں مولانا ابواعلیٰ مودودی کی تمام کتابیں ملکی مساجد کی لائبریریوں سے ہٹادی گئیں سعودی عرب سے پہلے بنگلہ دیش میں عوامی لیگ کی حکومت نے جولائی 2010 میں مولانا مودودی کی تفسیر القران سمیت تمام تصنیفات کو بلیک لسٹ قرار دے کر ملک کی 27 ہزار مکتب لائبریریوں سے اٹھانے کا حکم دیا۔ ان لائبریریوں کو سرکاری گرانٹ ملتی ہے۔چلیے بنگلہ دیش کی عوامی لیگی حکومت کے بارے میں تو طے ہے کہ اس نے ہمیشہ جماعتِ اسلامی اور اس کے بانی کو نظریاتی دشمن سمجھا اور ان سے اسی طرح نپٹا بھی۔ لیکن سعودی عرب تو ایسا نہ تھا۔جس زمانے میں جمال ناصر کی عرب قوم پرستی ہر جانب چھا رہی تھی اس دور میں سعودی اسٹیبلشمنٹ اخوان المسلمون سے ہمدردی رکھتی تھی۔ جب افغانستان میں روسی فوج اتری تو سعودی عرب، پاکستانی اسٹیبلشمنٹ اور جماعتِ اسلامی یک جان دو قالب تھے۔مگر یہ دن بھی آ گیا کہ سعودی عرب نے گذشتہ برس (مارچ 2014) اخوان کو دہشت گرد تنظیم قرار دے دیا اور اب اخوانی مصنفین کے ساتھ ساتھ مولانا مودودی کی تصانیف بھی سعودی مملکت کے لیے نظریاتی خطرہ ٹھہریں۔لیکن حسن البنا، سید قطب اور یوسف القرداوی کے برعکس مولانا کو تو اعلیٰ ترین علمی ایوارڈ عطا ہوا تھا۔تو پھر یہ کیا ہوا کہ

فرشتوں سے بھی اچھا میں برا ہونے سے پہلے تھا
وہ مجھ سے انتہائی خوش خفا ہونے سے پہلے تھا

دیکھنے کی بات یہ ہوگی کہ جس غیر معمولی اسلامی سکالر کو غیر معمولی خدمتِ اسلام پر 36 برس پہلے کنگ فیصل ایوارڈ ملا۔اسی سکالر کی وہی تحریریں ممنوع ہونے کے بعد کنگ فیصل ایوارڈ بھی واپس لیا جاتا ہے کہ نہیں۔ یا تو وہ کورچشم فیصلہ تھا یا پھر تازہ فیصلہ غلط ہے۔مگر وہ بادشاہ ہی کیا جس کا کوئی فیصلہ کبھی غلط ہو۔اسی لیے تو سیانے کہتے ہیں کہ بادشاہ کی اگاڑی سے بھی بچو اور پچھاڑی سے بھی۔اس کی نگاہ بدلنے سے پہلے کی بات ہی...میں آسمان پر تھا، ستارہ زمین پر۔

اقبال و جناح اسلامی جمعیتِ طلبہ میں

وسعت اللہ خان بی بی سی اردو ڈاٹ کام، کراچی۔6 نومبر 2015

امیرِ جماعتِ اسلامی سراج الحق نے اسلامی جمعیتِ طلبہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ 'مجھے یقین ہے اگر علامہ اقبال اور قائدِ اعظم محمد علی جناح آج زندہ ہوتے تو وہ بھی اسلامی جمعیتِ طلبہ کے رُکن ہوتے کیونکہ جمعیت ہی وہ تنظیم ہے جس نے اقبال اور قائدِ اعظم کے پاکستان کی حفاظت کی ہے'۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ دونوں اکابرین جمعیت میں ہوتے نہ ہوتے البتہ جناح آج 139 برس اور اقبال 138 برس کے ضرور ہوتے۔زیادہ امکان ہے کہ اس پیرانہ سالی میں اقبال اور جناح جمعیت کے اجتماعات میں اُچھل اُچھل کے انقلاب انقلاب اسلامی انقلاب کے فلک شگاف نعرے لگانے کے بجائے جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ میں لخلخا رہے ہوتے۔اگر ایسا ہوتا تو پھر سراج الحق صاحب کہاں ہوتے؟ شاید اسی لیے سراج صاحب نے اقبال اور جناح پر صرف جمعیت ہی کے دروازے کھولے ہیں اور وہ بھی جمعیت کی نظامتِ اعلیٰ سے دستکش ہونے کے 24 برس بعد۔اسے کہتے ہیں کنی بچا کے کھیلنا۔سراجیہ ویژن کے مطابق آج اگر اقبال اور جناح ہوتے تو زیادہ سے زیادہ بیس اکیس برس کے طالبِ علم ہوتے۔تو پھر 1947 میں پاکستان کون کس سے کیوں بنواتا؟ سید مودودی تو بہرحال اس موڈ میں نہیں تھے۔اگر اقبال اور جناح آج کی جمعیت میں ہوتے تو پھر جمعیت کو 68 برس تک اقبال اور جناح کے نہ بنائے ہوئے پاکستان کی حفاظت کا موقع کیسے ملتا اور وہ بھی ایک متحدہ ہندوستان میں؟ سراج صاحب ذرا سا لیٹ ہو گئے کیونکہ ابھی چھ ماہ پہلے ہی جناح صاحب متحدہ قومی موومنٹ میں شامل ہو چکے ہیں۔ بلکہ شمولیت کہنا شاید درست نہ ہو جناح صاحب تو دراصل ایم کیو ایم کے بانی ہیں۔ثبوت یہ ہے کہ خود جناح صاحب کی جنم بھومی کراچی کے سابق میئر اور قومی اسمبلی میں ایم کیو ایم کے سابق پارلیمانی لیڈر ڈاکٹر فاروق ستار بھرے مجمع میں بتا چکے ہیں کہ 'جب خان لیاقت علی خان نے جناح صاحب سے دورانِ علالت پوچھا کہ ہم چلے گئے تو اس ملک کا کیا بنے گا تو قائد نے کہا کہ فکر مکاوا۔ہم نہ سہی ہمارے بعد الطاف ہوگا۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قائدِ تحریک ہی قائدِ اعظم کے ویژن کے صحیح وارث ہیں'۔ان حالات میں بہتر ہوا گر دونوں دعویدار (سراج الحق اور فاروق ستار) بیٹھ کے طے کر لیں کہ ان میں سے کون اقبال اور جناح کا فکری وارث ہے۔اس کے بعد چاہیں تو دونوں رہنما مرحومین سے رُکنیت کا فارم باری باری بھروا لیں۔ ویسے بھی سیاست کے فی زمانہ چلن (بلکہ بدچلنی) سے لوگ باگ اس قدر بددل ہو چلے ہیں کہ اب مردوں کو پھر سے زندہ کر کے فعال کرنے سے ہی کام چلے گا۔ وقت کی اس

ضرورت سے ایم کیوایم اور جماعتِ اسلامی سے زیادہ بھلا کون واقف ہے؟ سراج الحق کا ویژن دیکھ کر یونہی ذہن میں کچھ سوالات آرہے ہیں۔ اسلامی جمعیتِ طلبا کا قیام 23 دسمبر 1947 کو لاہور میں عمل میں آیا۔ جناح صاحب اس وقت حیات تھے۔ کیا جمعیت کے پہلے ناظمِ اعلیٰ ظفر اللہ خان نے جناح صاحب کو تاسیسی اجلاس کی سرپرستی کی دعوت دی تاکہ بانیِ پاکستان کو بھی لگ پتہ جائے کہ اب نوجوانوں کی وہ والی تنظیم وجود میں آگئی ہے جو ان کے پاکستان کی حفاظت کرے گی لہٰذا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کو لپیٹ دیا جائے۔ اگر جناح صاحب پاکستان بننے سے پہلے یا بعد میں جماعتِ اسلامی کو مسلم لیگ میں ضم کرنے کی صلاح دیتے تو مولانا مودودی کیا مان جاتے؟ تو کیا سیدی مودودی نے بھی کبھی جناح صاحب کو جماعتِ اسلامی میں شمولیت کا پیغام بھجوایا یا کبھی زبانی وتحریری، صراحتاً یا اشارتاً یقین دلایا کہ جمعیت کے بچے آپ کے بنائے ہوئے پاکستان کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دیں گے؟ گر تاریخ خواہشات کے تابع ہوجائے تو مسائل ہی حل ہوجائیں۔ سراج الحق صاحب کے خطاب پر جمعیت کے نوجوانوں نے تالیاں تو خوب بجائیں۔ مگر سراج صاحب کا مقصد کیا زوردار تالیاں پٹوانا ہی تھا؟ اور اب جو میڈیا میں ڈنکا بلکہ ڈنکی پٹ رہا ہے وہ؟ مجھے لگتا ہے آج اگر اقبال اور جناح ہوتے تو نہ ایم کیوایم میں ہوتے نہ جمعیت میں بلکہ منٹو کے ٹوبہ ٹیک سنگھ کی طرح کسی درخت پر چڑھے ہوئے ہوتے اور فاروق ستار اور سراج الحق اس درخت کو زور زور سے ہلا رہے ہوتے۔

نثار علی کی نثاریاں

وسعت اللہ خان بی بی سی اردو ڈاٹ کام، کراچی 5 ستمبر 2014

جس زمانے میں ضیا الحق کے خلاف ایم آر ڈی کی تحریکِ بحالیِ جمہوریت عروج پر تھی تو اسٹیبلشمنٹ نے احتجاجی جلوسوں کا زور توڑنے کے لیے یہ طریقہ ایجاد کیا کہ چلتے جلوس میں کچھ سادہ لباس سیاسی ورکر ٹائپ چہرے شامل کروا دیے جاتے۔ یہ ورکر جمہوریت زندہ باد، ضیا الحق مردہ باد کے نعرے لگواتے لگواتے جلوس کو مقررہ راستے سے بھٹکا کر اس جانب لے جاتے جہاں پولیس کی قیدی گاڑیاں کھڑی ہوتیں اور پھر مظاہرین کی پکڑ دھکڑ میں حکومت مخالف نعرے لگوانے والے یہ سادے بھی شامل ہو جاتے۔ جانے کیوں وزیرِ داخلہ چوہدری نثار علی خان کو دیکھ کر ایم آر ڈی کے جلوس کو بھٹکانے کی ڈیوٹی پر مامور وہ سادہ لباس نعرہ باز یاد آجاتا ہے۔ منگل سے جاری اچھا بھلا پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس جب یہ تاثر دینے لگا کہ جمہوری نظام کو لپیٹنے کی بالائے آئین سازشوں کے خلاف 99 فیصد سیاسی جماعتیں اپنے نظریات وشکایات سے بالاتر ہو کر دیوار کی صورت کھڑی ہیں اور ان کی ساری توجہ دھرنے کی غیر پارلیمانی سیاست ختم کرانے پر ہے۔ عین اس وقت ملک میں امن وامان کے قیام کے ذمہ دار وزیرِ داخلہ چوہدری نثار علی خان کی رگِ پراسراریت پھڑکی۔ انہوں نے اپنے کولھے سے لگی گن سیدھی کر کے سینیٹ کے قائدِ حزبِ اختلاف بیرسٹر اعتزاز احسن پر داغ دی اور ان پر لینڈ مافیا کے مقدمے لڑنے اور ایل پی جی گیس کا ناجائز کوٹا لینے کے الزامات لگا دیے۔ بندہ پوچھے کہ ان الزامات کی صحت سے قطع نظر ان کا ملک اور حکومت کو درپیش حالیہ بحران سے کیا براہ راست تعلق بن رہا ہے اور وہ بھی ایسے وقت جب پارلیمنٹ اور حکومت سڑک پر معاملات طے کرنے والوں کے محاصرے میں ہے۔ یہ سوال بھی اُٹھ رہا ہے کہ جس وزیرِ اعظم کا وزیرِ داخلہ اس کے کنٹرول میں نہیں تو پھر کس کے کنٹرول میں ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پارلیمنٹ کا چوتھا دن وزیرِ اعظم کی جانب سے معافی تلافی اور اعتزاز احسن کی دھواں دار جارحانہ صفائی کی نذر ہوگیا اور یہ بات بھی ظاہر ہوگئی کہ جمہوریت اور آئین پسندوں کا اتحاد کیسے پل صراط پر کھڑا ہے۔ کچھ اور ہو نہ ہو اس پارلیمانی تماشے سے باہر کھڑے کنٹینری مقررین کے ہاتھ میں نیا ایمونیشن آگیا اور ٹی وی چینلوں کے اونگھتے ٹاک شوز میں ایک بار پھر زندگی پڑ گئی۔ اب یہ سوال بھی اُٹھ رہا ہے کہ جس وزیرِ اعظم کا وزیرِ داخلہ اس کے کنٹرول میں نہیں تو پھر کس کے کنٹرول میں ہے۔ انھی وزیرِ داخلہ نے اگست کے شروع میں کہا تھا کہ لاہور سے آنے والا لانگ مارچ اسلام آباد میں نہیں گھسنے دیا جائے گا۔ پھر انھی وزیرِ داخلہ نے کہا کہ مارچ کو آبپارہ سے آگے کسی صورت نہیں بڑھنے دیا جائے گا۔ پھر انھی وزیرِ داخلہ نے کہا کہ ریڈ زون کی لکیر کسی صورت عبور نہیں کرنے دی جائے گی۔ پھر انھی وزیرِ داخلہ نے کہا کہ ریڈ زون سے آگے کسی صورت نہیں جانے دیا جائے گا۔ اور پھر یہ ہوا کہ مظاہرین نے کپڑے دھو کر سپریم کورٹ کے جنگلے سے لٹکا دیے۔ پارلیمنٹ کے سبزہ زار میں صابن مل کے نہانا شروع کر دیا، پی ٹی وی کی تاریں کاٹنے کے بعد کینٹین میں کھانا بھی اُڑایا اور وزیرِ داخلہ 'اِب کے مار، اِب کے مار' ہی کرتے رہ گئے۔ آج وزیرِ اعظم پارلیمنٹ میں سر جھکا کے ہر تقریر سن رہے ہیں مگر وزیرِ داخلہ کا طنطنہ کسی جنرل رومیل سے کم نہیں۔ کیا یہ وہی نثار علی خاں تو نہیں جنھوں نے اپنے بڑے بھائی اور سیکریٹری دفاع جنرل (ریٹائرڈ) چوہدری افتخار علی خاں مرحوم کے ساتھ مل کے منگلا کے کور کمانڈر جنرل پرویز مشرف کا نام بطور چیف آف آرمی سٹاف وزیرِ اعظم کے سامنے رکھا تھا کہ 'اینہوں بنالو، سدھا سادھا اردو سپیکنگ بندہ لگدا جے۔' پُل ہیں یا 'پش اینڈ پل' لوگ کہتے ہیں چوہدری نثار کو ساتھ رکھنا میاں برادران کی مجبوری ہے بھلے اس کی قیمت جاوید ہاشمی جیسوں کی قیمت دے کر ہی کیوں نہ چکانی پڑے اور یہ کہ فوج اور میاں برادرز کے درمیان چوہدری نثار علی ہی ایک مضبوط پل ہیں مگر یہ کون طے کرے کہ یہ واقعی پل ہیں یا پش اینڈ پل ہیں اور یہ کہ اس پل کے کھلنے بند ہونے کی چابیاں کس کے پاس ہیں؟ کیا یہ وہی چوہدری صاحب تو نہیں جنھوں نے اسی جنرل پرویز مشرف پر عین اس روز آئین کے آرٹیکل چھ کے تحت مقدمہ بغاوت

چلانے کا اعلان کیا جس دن راولپنڈی شیعہ سنی فساد سے جل رہا تھا تاکہ میڈیا کو کھیلنے کے لیے دوسری گینڈمل جائے۔اور کیا یہ وہی چوہدری صاحب تو نہیں جو بعد میں اس بات کے حامی ہو گئے کہ بغاوت کی فردِ جرم عائد ہونے کے بعد مشرف صاحب کو بیرونِ ملک جانے کی اجازت دے دی جائے اور جب وزیرِ اعظم نے بات نہیں مانی تو چوہدری صاحب ایسے روٹھ گئے کہ کراچی ایئرپورٹ پر دہشت گردوں کے حملے کے بعد بھی ان کا فون ساری رات بند رہا۔یہ کیسے وزیرِ داخلہ ہیں جنھوں نے اب سے ہفتہ بھر پہلے دھرنا بحران میں فوج کی ثالثی کی خبر دی مگر انھی کے وزیرِ اعظم نے بھری پارلیمان میں اس مبینہ کردار کی تردید کر دی اور پھر فوج کے شعبہ تعلقاتِ عامہ کو ایک علیحدہ بیان جاری کرنا پڑ گیا۔ان پے در پے 'اِفی شنسیوں' کے بعد مہذب یا غیر مہذب کی بحث سے قطع نظر کوئی اور ملک ہوتا تو اس کا وزیرِ داخلہ خود ہی استعفیٰ دے کر کنسلٹینسی سے پیسے کمانے شروع کر دیتا مگر پاکستان 'کوئی اور ملک' تو نہیں ہے۔لوگ کہتے ہیں چوہدری نثار کو ساتھ رکھنا میاں برادران کی مجبوری ہے۔

دہشت گردی کی درس گاہیں

عاصی صحرائی

یہ ایک عام اسکول ہے،لیکن یہاں دی جانے والی تعلیم یکسر مختلف ہے۔ایک کلاس میں سیاہ پوش بچے بہت ہی انہماک سے پروجیکٹر پر چلنے والی ویڈیوں دیکھنے میں مصروف ہیں، اسکرین پر دکھائی دینے والے مناظر کسی بھی ذی ہوش فرد کو خوف زدہ کرنے کے لئے کافی ہیں،لیکن یہاں موجود بچوں کے کے لئے ان کے نصاب کا حصہ ہے۔دوسری کتاب میں ان بچوں کے ہاتھوں میں قلم، کتاب کی جگہ ایک بہت ا ہی انوکھی چیز ہے، ایک ایسی شئے جو دنیا بھر میں لاکھوں لوگوں کی ہلاکت کی ذمہ دار ہے، ایک ایس شئے جس کا موجد بھی اس اس ایجاد پر ساری زندگی انسانی کے سامنے شرم سار رہا۔کلاس روزمرہ کے سامنے ہی بچوں کے لئے روزمرہ کا کھیل ہے۔لیکن اس میدان میں بچے کرکٹ فٹ بال ہاکی کی بجائے ایک انوکھا کھیل کھیلنا سیکھ رہے ہیں۔ ایک ایسا کھیل جس نے دنیا بھر میں لاکھوں زندگیوں کے چراغ گل کر دئے۔یہاں ان بچوں کو اس کھیل کے جدید طریقے وحشت و بربریت کے پُرتشدد طریقے، جیتے جاگتے انسانوں کو زیادہ اذیت ناک موت دینے کے طریقے معصوم لوگوں کے حلقوم کے شہ رگ کو کاٹنے کے طریقے سکھائے جا رہے ہیں۔

اس اسکول کا نصاب بھی مختلف ہے ان درسی کتب میں امن و محبت کے ساتھ رہنے، دوسروں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنے کے بجائے مذہب کے نام پر نفرت کا پرچار کرنے دوسرے عقائد و مذہب کے لوگوں کو بربریت کا نشانہ بنانے کا سبق پڑھایا جاتا ہے۔بچے کی صلاحیتوں کی جانچ یہاں بھی کی جاتی ہے۔لیکن استاد طالب علم کے درمیان سوال و جواب کا سلسلہ کچھ یوں ہے۔

استاد: یہ کیا ہے؟

طالب علم: کلاشنکوف

استاد: ہم اسے کس لیے استعمال کرتے ہیں؟

طالب علم: اپنے عقیدے کی حفاظت کے لئے۔

یہ نہ ہی کسی فلم کی کہانی ہے اور نہ اس میں کسی قسم کی مبالغہ آمیزی ہے۔یہ ایک حقیقت ہے ایسی حقیقت جس نے بنی نوع انسان کا سر شرم سے جھکا دیا ہے۔یہ مناظر داعش کی جانب سے قائم کی گئی نام نہاد خلافت اسلامیہ اور افغانستان کے صوبے کُنڑ کی تحصیل میں قائم کئے گئے 'جہاد اسکول' کے ہیں۔داعش کے سوشل میڈیا اکاؤنٹ پر جاری ہونے والے جہاد اسکول کی تصاویر اور ویڈیوز میں معصوم بچوں کو وحشت و بربریت کی تربیت دینے کے مراحل دکھائے گئے ہیں۔ان تصاویر اور ویڈیوز میں دس گیارہ سال کے بچوں کو کھیل کے میدان اور کلاس رومز میں کلاشنکوف کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔داعش کی میڈیا ونگ موسیسات الفرقان کی جانب سے ریاست اسلامیکے شیر کے بچے کے عنوان سے جاری کی گئی ویڈیو میں بچوں کو دی جانے والی جنگی تربیت کے مناظر بھی شامل ہیں۔ان اسکول میں عربی زبان میں بچوں کو سرقلم کرنے مخالفین کو بے رحمانہ طریق سے قتل کرنے، بم بنانے اور مہلک آتشین اسلحہ چلانے کی تعلیم و تربیت دی جا رہی ہے۔داعش کے ہی ایک اور میڈیا ونگ التصام میڈیا کی جانب سے بھی جہاد اسکول میں دی جانے والی تعلیم کے حوالے سے سماجی رابطوں کی ویب سائٹس پر بھرپور مہم جاری ہے جس کا مقصد داعش کے زیر اثر علاقوں مین دہشت کی فضا قائم کرنا ہے غیر ملکی ذرائع ابلاغ پر نشر ہونیوالی کچھ ویڈیوز میں جدید اسلحے سے لیس بچے بھی جنگ جوؤں کے ساتھ لڑتے ہوئے دکھائے دے رہے ہیں۔یہ بچے جہادی اسکول سے ہی فارغ التحصیل ہیں۔داعش کی طرف سے یہ تصاویر اور ویڈیوز اقوام متحدکی انسانی حقوق کونسل کی اس رپورٹ کے بعد جاری کئے گئے ہیں جس میں کہا گیا تھا کہ داعش نے اسکول کی آڑ میں تربیت کیمپ قائم کئے ہیں جہاں تعلیم کے نام پر بچوں کو بھرتی اور دہشت گردی کی تعلیم دی جا رہی ہے۔رپورٹ ک مطابق ان کیمپوں میں بھرتی کئے جانے والے بچوں کو روز اول سے ہی مذہبی تعلیم اور اسلحہ چلانے کی تربیت کا آغاز کر دیا جاتا ہے۔جہاد اسکول کے نام پر بنائے گئے ان کیمپوں میں داعش کے ایک دہشت گرد ایک مضبوط نظام کے ذریعے بچوں کو عسکری تربیت دے رہے ہیں۔اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے بچے (مستقبل کے دہشت گرد، خودکش بمبار) وکو گریجوئٹ قرار دے کر لڑائی کے میدان میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں یہ جنگ و جدل کے ساتھ خودکش حملے کے مشنکو بھی سرانجام دیتے ہیں۔اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے مطابق 15 سال سے کم عمر بچوں کی عسکری اداروں اور گروہوں میں بھرتی اور عسکری تربیت جنگی جرائم

کے زمرے میں آتی ہے۔ داعش ان جہادی اسکولوں میں بچوں کی بھرتی کے سنگین جنگی جرائم کی مرتکب ہورہی ہے۔ دنیا بھر میں انسانی حقوق کی تنظیموں سے داعش کی جانب سے جاری کی گئی جہادا سکولوں کی ویڈیوز کو شرم ناک قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ داعش اپنے مذموم مقاصد کے لئے بچوں کو بھی بے دریغ استعمال کررہی ہے۔ جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔۔ایمینیسٹی انٹرنیشل برطانیہ کی شام کی کیپٹن میجر کرسٹیانا بینی ڈکٹ کا اس حوالے سے کہنا ہے کہ ’’نقاب پوش مسلح افراد کی اسٹیج پر کھڑے ہوکر بچوں کو دی جانے والی دہشت گردی کی تربیت نے یقینا ہر دردمند دل رکھنے والے کو متاثر کیا ہے۔‘‘ کرسٹیانا کے مطابق سوشل میڈیا پر جاری ہونے والی ویڈیوز اس بات کا ثبوت ہیں کہ داعش وحشت و بربریت کے لئے بڑے پیمانے پر معصوم ذہنوں کی برین واشنگ کررہی ہے۔اُن کا کہنا ہے کہ ’’بین الاقوامی قوانین میں واضح طور پر بچوں کو بطور فوجی استعمال کرنے کی سختی سے ممانعت ہے اور داعش کی کم عمر بچوں کو بہ طور جنگ جو استعمال کرنے سے اُس کے خلاف چارج شیٹ میں مزید جرائم کا اضافہ ہورہا ہے۔

انسداد دہشت گردی کی برطانوی تھنک ٹینک Qualliam فاؤنڈیشن کے ترجمان چارلی ونٹر کا کہنا ہے کہ ’’ اگر داعش اپنے زیر تسلط علاقوں میں بچوں کو اسلحہ چلانے دہشت گردی کی تربیت دے رہی ہے تو اس میں کوئی اچنبے کی بات نہیں۔لیکن داعش جہادا سکول کی ویڈیوز اور تصاویر کی مدد سے جہادی نظریات پر یقین رکھنے والوں کے لئے خود کو ایک مثالی ریاست کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کررہی ہے جو یقینا دہشت گرد تنظیموں کے لئے ایک مثال بن سکتی ہے‘‘۔

گزشتہ ماہ ایک غیر سرکاری تنظیم’’ سیریا ڈائرکٹ‘ نے اپنی ایک رپورٹ مین شام کے مشرقی شہر دیرالزور میں داعش کی جانب سے ایلمنٹری اسکول کھولنے کا ذکر کیا ہے ۔مقامی خبررساں ایجنسی ’اسٹیپ نیوز‘ کے مطابق اس اسکول میں بچوں کو نہ بھیجنے والے والدین کو جرمانے عائد کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں گرفتا بھی کیا جارہا ہے میادعین (شامی قصبے) میں بنائے گئے اسکول میں نہ صرف لڑکوں بل کہ لڑکیوں کی بھی زبردستی داخل کیا جارہا ہے۔ داعش پہلے ہی اس خطے میں ریاضی، طبیعات، فلسفے موسیقی تاریخ اور جغرافیے کی تعلیم کو غیر اسلامی قرار دے کر اپنا بنایا تعلیم نصاب لاگو کرچکی ہے۔ جب کہ داعش کا نصاب نہ پڑھانے والے استاد کو بدترین جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ داعش کی ان تعلیم دشمن سرگرمیوں کو نقشہ استاد ابو (فرضی نام) نے کچھ اس طرح کھینچا ہے ’’ نام نہاد خلافت اسلامیہ کی داعی داعش کے مطابق ایک فلاحی ریاست کے لئے ان کی مرتب کردہ نصابی کتب ہی ہر بچے کو پڑھانی چاہیئیں۔ اور ان (داعش کے دہشت گرد) کی حکم عدولی کرنے والے اساتذہ کو کم سے کم تیس کوڑوں کی سزا دی جاتی ہے لیکن سزا سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمارا آنے والی نسلیں جدید علوم سے لاعلم ہوں گی۔ یہ بچے ہاتھوں میں قلم کی بجائے ہتھیار تھامے ایک ایسے ماحول میں بڑے ہورہے ہیں جہاں خون خرابہ قتل و غارت گری معمولی بات ہے ان بچوں کو نہ صرف آتشیں ہتھیار چلانے کی ٹریننگ دی جارہی ہے بلکہ سر قلم کرنے اور کئی پھانسیوں کے عینی شاہد بھی ہیں۔ یقینا بچپن سے ہی اس ماحول میں تربیت حاصل کرنے والے بچوں سے جوان میں کسی رحم دلی کی اُمید رکھنا بعید از قیاس ہے‘‘۔گذشتہ ماہ مشرقی افغانستان کے گاؤں شیگل میں کھلنے والے جہادا سکول سے چارلی ونٹر کے خدشات کو مزید تقویت ملتی ہے۔ امریکا کی پبلک براڈ کاسٹنگ سروس (پی بی ایس) کی ایک دستاویزی فلم ’ آئی ایس آئی ایس ان افغانستان‘ کے مطابق یہ اسکول خود کو داعش کے اتحادی قرار دینے والے جنگ جوؤں کی جانب سے کھولا گیا ہے، جو یہاں رہنے کے ساتھ ساتھ مقامیوں سے محصول بھی وصول کرتے ہیں۔ اس جہادا سکول میں کم سن بچوں کو پستول سے لے کر بھاری ہتھیار تک چلانے کی تربیت دی جارہی ہے۔ یہاں بچوں کی جنگی تربیت کے ساتھ ان کی برین واشنگ بھی کی جارہی ہے۔ اگر داعش اور اس کی حلیف دہشت گرد تنظیموں کی تعلیم کے نام پر وحشت و بربریت سکھانے کی مذمت اور ایسے اسکولوں کے قیام کی سرکوبی نہ کی گئی تو پھر یقیناً ان علاقوں میں پرورش پانے والے بچے بھی مستقبل میں اپنے مخالف فرقے، مذہب سے تعلق رکھنے والے افراد کے ساتھ وہ بربریت کا وہ کھیل کھیلیں گے جسے دیکھ کر ہمیں اُن کے تربیت کاروں (داعش اور اس کی حلیف دہشت گرد تنظیموں) کی دہشت گردی بھی معمولی لگے۔

صلیبی معرکوں سے وسائل پر قابض ہونے کی جنگ تک کا ایندھن: معصوم بچے!

بچوں کو جنگی مقاصد میں استعمال کرنے کا رواج کچھ نیا نہیں۔ اگر ہم تاریخ پر ایک نظر ڈالیں تو بچوں کو پہلی بار جنگی مقاصد میں استعمال کرنے کا ذکر 1212 کی صلیبی جنگوں میں ملتا ہے۔ جنگ میں لگاتار شکست کھانے کے بعد عیسائیوں کی مذہبی وعسکری قیادت نے بچوں کو جنگ کا ایندھن بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس مذموم مقصد کے لیے انہوں نے اٹلی کے شمالی علاقوں کو منتخب کیا، جہاں اسٹیفن نامی بارہ سالہ بچے کی قیادت میں ہاتھوں میں لکڑی کی صلیبیں تھامے سیکڑوں بچے بلند آواز میں مذہبی گیت گاتے ساحل سمندر کی جانب گام زن تھے۔ مذہبی پیشواؤں نے ان بچوں کو یہ باور کرادیا تھا کہ ساحل پر پہنچنے پر سمندر اُن کا راستہ بنانے کے لیے سمٹ جائے گا اور وہ مقدس سرزمین پر پہنچ کر سب مسلمانوں کو عیسائی کرلیں گے۔ اس وقت چرچ کی تاریخ کے طاقت ور ترین پوپ انوسنٹ نے بچوں کے اس سفر کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہوئے کہا’’ یہ ہمارے لیے باعثِ شرم ہے کہ بچے تو سرزمین مقدس کی آزادی کے لیے نکلیں اور ہم گھروں میں بیٹھے رہیں۔‘‘ مذہبی اور سیاسی قیادت نے تو اپنا مقصد حاصل کرلیا۔ لیکن اُن بچوں کو بہت عبرت ناک انجام سے دوچار ہونا پڑا۔ دورِ حاضر میں تہذیب وتمدن کا پرچار کرنے والے انسانوں نے بچوں کو بڑے پیمانے پر جنگوں، گروہی لڑائیوں میں استعمال کرنا شروع کردیا ہے۔ اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے یونیسیف کے

اعداد وشمار کے مطابق صرف گذشتہ سال ہی تقریباً 4 لاکھ بچوں کو جنگی تربیت دی گئی یا انہیں گروہی لڑائیوں میں استعمال کیا گیا اور اس مقصد کے لیے پوری دنیا میں مزید ہزاروں بچوں کو فوجی اور عسکریت تربیت کے لیے بھرتی کیے جانے کا امکان ہے۔ اقوام متحدہ کی بچوں اور مسلح تنازعات کے حوالے سے مرتب کی گئی اس رپورٹ میں داعش، القاعدہ کی ذیلی جماعت جبھۃ النصرہ، احرار الشام، کردش پیپلز پروٹیکشن اور نائیجریا کا انتہا پسند گروپ بوکوحرام آٹھ سرکاری افواج اور 51 مسلح گروپوں بھی شامل کیا گیا ہے۔ رپورٹ کے مطابق یہ دہشت گرد اور عسکریت پسند گروپ بچوں کو گروہی اور عسکری لڑائیوں میں استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ جنسی زیادتی، یا خودکش حملوں کے لیے استعمال کر رہے ہیں اور اس کام کے لیے دنیا بھر میں بچوں کی بھرتیوں کا سلسلہ بنا کسی رکاوٹ کے جاری ہے۔ حکومتی سطح پر بچوں کو بہ طور فوجی استعمال کرنے میں برما کی حکومت سرفہرست ہے۔

بچوں کے جنگوں میں استعمال کی روک تھام کے لیے کام کرنے والی ایک غیر سرکاری تنظیم 'وار چائلڈ' کے حالیہ اعداد وشمار کے مطابق برما میں تقریباً 80 ہزار بچوں کو مختلف باغی گروپوں اور سرکاری فوج میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ انسانی حقوق کی بین الاقوامی تنظیم ہیومن رائٹس واچ کے مطابق میانمار میں ہر پانچواں فوجی 18 سال سے کم عمر ہے، جب کہ گذشتہ پندرہ سالوں میں دنیا کے تقریباً ہر خطے میں بچوں کو جنگ کا ایندھن بنانے میں کی شرح میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے، جب کہ بچہ فوج میں تقریباً تیس فی صد تعداد معصوم کم عمر لڑکیوں کی ہے، جنہیں میدان جنگ کے علاوہ جنسی استحصال کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے اور ان میں سے کچھ بچوں کی عمریں تو دس سال سے بھی کم ہیں۔ امریکی اخبار ''واشنگٹن پوسٹ'' کے مطابق یمن کے حوثی باغی بھی بچوں کو میدان جنگ میں بھرپور طریقے سے استعمال کر رہے ہیں۔ حوثی باغیوں نے خود اپنی صفوں میں شامل ایک تہائی بچوں کے 18 سال سے کم عمر ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ اپنے مفادات کی ہوس میں حوثیوں نے بچوں سے قلم چھین کر انہیں ہتھیار دے کر میدان جنگ کا ایندھن بنایا دیا ہے۔ ان کے ناتواں کندھوں پر بندوق رکھ دی ہے۔ ان سے اسکول کے یونیفارم چھین لیے گئے ہیں۔ اب وہ فوجی وردی پہن کر جنگ میں شریک ہیں۔ رپورٹ کے مطابق یمن میں اس وقت حوثی جنگ جوؤں کی کل تعداد 25 ہزار کے لگ بھگ ہے، جس کا ایک تہائی ایسے بچوں پر مشتمل ہے جن کی عمریں محض 13 سے 18 سال کے درمیان ہیں۔ حوثی شدت پسندوں کی جانب سے اپنی صفوں میں کم عمر بچوں کو بھرتی کرنے کا عمل نیا نہیں، تاہم حوثیوں کا دعویٰ ہے کہ بچوں کو براہ راست لڑائی کے بجائے سیکیورٹی چیک پوسٹس پر تلاشی کے لیے بھرتی کیا گیا ہے۔ حوثیوں کے علاوہ القاعدہ کے دہشت گرد بھی یمن میں بچوں کو جنگ کے لیے بھرتی کرتے رہے ہیں۔ ان دونوں کی جانب سے جنگ کے لیے بھرتی کیے گئے بچوں کو فی کس ماہانہ 100 ڈالر تک اُجرت بھی دی جاتی ہے اور خط غربت سے نیچے زندگی گزارنے والے یمنی باشندے چند پیسوں کے لیے اپنے بچوں کو بھرتی کروا رہے ہیں۔

(یو کے ٹائمز لندن 10 دسمبر 2015ء)

غزل

آدم چغتائی برمنگھم یو کے

دُنیائے دَرد کی یہ روایت عجیب ہے
اِحساس راہنما ہے محبت نصیب ہے

خضرِ رہِ حیات کے جو بھی قریب ہے
راہِ وفائے عشق میں وہ خوش نصیب ہے

اُس بے مثال حُسن سے کیسی ہیں نسبتیں
ان نسبتوں سے ہر کوئی میرا رقیب ہے

مژدہ دیا تھا جس کے لبوں نے حیات کا
وہ شخص ہی بہارِ چمن کا نقیب ہے

ملتا ہے غم کسی کو،کسی کو مسرتیں
ہر شخص کا جُدا جُدا اپنا نصیب ہے

یہ فاصلوں کی بات نہیں نسبتوں کی ہے
جتنا ہے کوئی دُور اُتنا قریب ہے

آدم سفر کا کرب اُٹھا کر نہ اُف کرو
مت سوچنا کہ دن ہے کٹھن شب مہیب ہے

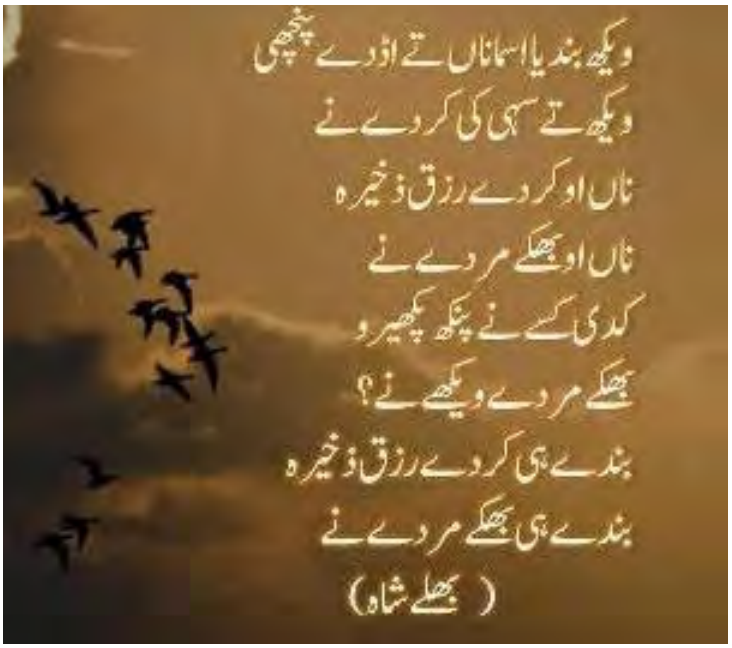

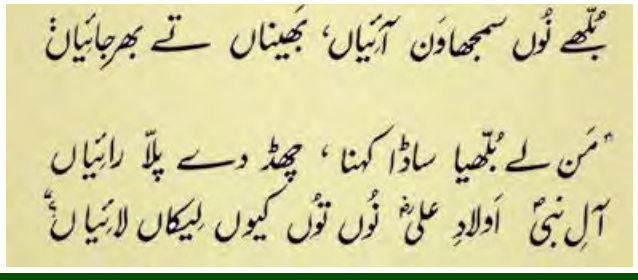

ایک شام مضطر عارفی کے نام

(پیشکش: عاصی صحرائی)

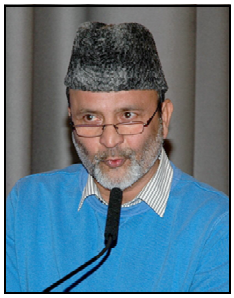

(نامہ نگار خصوصی کے قلم سے)

مورخہ 4 دسمبر 2015 کو اردو جرمن کلچرل سوسائٹی فرانکفورٹ کے زیر اہتمام Salibau Nordqwar Zentrum Frankfurt میں محترم چوہدری محمد علی صاحب مرحوم کی یاد میں ایک خوبصورت تقریب منعقد ہوئی جس کے روح رواں سوسائٹی کے صدر جناب عرفان احمد خان تھے۔ اس تقریب کی صدارت لندن سے خصوصی طور پر تشریف لائے ہوئے معروف نوجوان شاعر جناب فاروق محمود صاحب نے کی۔

ابتداء میں تقریب اور چوہدری صاحب موصوف کا مختصر مگر جامع انداز میں تعارف تقریب کے میزبان عرفان خان صاحب نے کرایا۔ پھر تلاوت قرآن کریم کے بعد چوہدری صاحب کا نعتیہ کلام مکرم اسد اللہ خان صاحب نے پیش کیا۔ اس کے بعد جناب اسحٰق ساجد صاحب اور جناب محمد انیس دیالگڑھی نے چوہدری صاحب موصوف کی شاعری پر مضامین پڑھے۔ مقالہ نگاروں نے چوہدری صاحب کے مجموعہ کلام اشکوں کے چراغ کا ادبی نقطہ نظر سے تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ چوہدری صاحب کی شاعری میں حسن و جمال، عشق و محبت، فراق و وصال اور خار و گل کے تذکرے بھی ملتے ہیں تو اخلاص و فدائیت اور ایثار و قربانی کا درس بھی ملتا ہے۔

اس تقریب کے لئے کینیڈا سے جناب ڈاکٹر

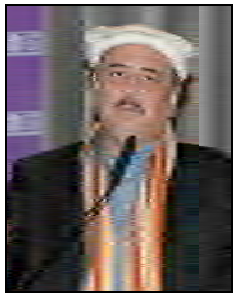

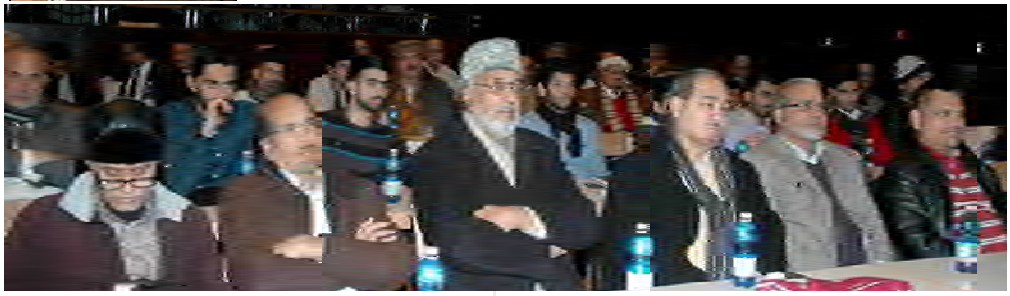
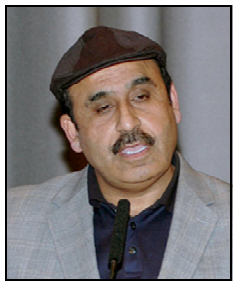

پرویز پروازی صاحب نے ایک خصوصی مقالہ ارسال کیا تھا جسے جناب عثمان احمد خان نے بہت عمدہ انداز میں پڑھ کر سنایا۔اس مقالہ میں محترم پروازی صاحب نے چوہدری صاحب کی شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ کی جماعت اور خلافت سے بے مثال محبت اور اخلاص کا تذکرہ شامل تھا۔

آخر پر صدارتی خطاب سے پہلے میر نسیم الرشید نے چوہدری صاحب کا کلام خوش الحانی سے پڑھا۔ صدر اجلاس جناب فاروق محمود صاحب نے اپنے خطاب میں نہایت گہرائی سے اشکوں کے چراغ پر روشنی ڈالی۔ آپ نے فنی نقطہ نگاہ سے بتایا کہ چوہدری صاحب کے ہاں ایسی شاعری ملتی ہے جو دوسرے شعراء کے ہاں بہت کم ہے کیونکہ آپ نے بعض ایسی بحروں میں بھی اشعار کہے ہیں جو بے حد مشکل ہیں۔انہوں نے چوہدری صاحب کے اشعار میں پائی جانے والی فصاحت و بلاغت، خیال آرائی، الفاظ کی بندش اور تراکیب کے حوالہ سے کلام کی خوبیاں بیان کیں ۔ نیز بتایا کہ چوہدری صاحب ایک فلسفی تھے جو عموماً خدا کے منکر اور محبت و اخلاص سے عاری ہوتے ہیں۔مگر چوہدری صاحب کے ہاں یہ عناصر نمایاں ہیں۔

اس کے بعد کھانے کا وقفہ ہوا۔ پھر ایک دلچسپ اور گرم جوش محفل مشاعرہ برپا ہوئی۔جس میں جناب مرتضیٰ منان نوید اقبال اور میر عبدالرشید نے چوہدری صاحب کا کلام سنا کر آواز کا جادو جگایا۔علاوہ ازیں برلن سے جناب حنیف تمنا، ہمبرگ سے عبدالجلیل عباد بوڈن زے سے اسحاق ساجد، مورفیلڈن سے مدبر آسان، فلڈا سے محترم شازیہ نسرین ، راڈے فورموالڈ سے لئیق شائق ، فرانکفورٹ کے راجہ محمد یوسف ، طاہر مجید، اقبال حیدر، طفیل خلق، اوفن باخ سے طاہر عدیم، نے اپنا کلام پیش کیا اور حاضرین سے بھرپور داد لی۔

اس خوبصورت شام کے انعقاد کے لئے بادمیرین برگ کے مکرم خواجہ مظفر احمد صاحب اور نوئس کے مکرم منیر طاہر صاحب نے خصوصی تعاون کیا۔ اسی طرح محترم محمد انیس دیالگڑھی، سید افتخار شاہ، عامر افتخار، شیخ سلیم احمد، عامر پاشا، مشرف انور اور چوہدری مبارک اعجاز انتظامی امور میں پیش پیش رہے۔اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر سے نوازے اور محترم چوہدری محمد علی صاحب مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور ان کی نیکیوں، خوبیوں ، خدمات اور قربانیوں کو ہمیشہ زندہ رکھے۔آمین

ڈونلڈ ٹرمپ اور مسلمان
امریکی تہذیب کے مسلمان معمار

ذکریا ورک
کینیڈا

دسمبر 2015ء کے شروع میں امریکی سیاست دان ڈونلڈ ٹرمپ Donald Trump نے یہ اشتعال انگیز بیان دیا کہ امریکہ میں مسلمانوں کی آمد پر وقتی طور پر پابندی لگا دی جانی چاہئے۔ان کے اس احمقانہ بیان دینے کی وجہ سان برنا ڈینو میں 14، افراد کے قتل کا افسوس ناک، اور دردناک واقعہ تھا جس میں دو پاکستانیوں نے اس بہیمانہ قتل عام میں حصہ لیا تھا۔لیکن یہ ہرزہ سرائی ری پبلکن پارٹی کے صدارتی امید واروں کی طرف سے روز اوّل سے جاری ہے۔اس سے پہلے موصوف یہ بھی ارشاد فر ما چکے ہیں کہ وہ صدر بن کر مساجد ختم کر دیں گے جہاں نوجوانوں کو شدت پسندی کی تعلیم دی جاتی ہے۔اور یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ امریکہ سے مسلمانوں کو بے دخل پر سنجیدگی سے غور کیا جائیگا۔ ہر مذہب، ہر کمیونٹی سے تعلق رکھنے والے زعماء نے اس بیان کی شدت سے تردید کی ہے۔ٹورنٹو کے ایک سٹی کونسلر نے مطالبہ کیا کہ ڈاؤن ٹاؤن میں واقع ٹرمپ ٹاور سے اس کا نام مٹا دیا جائے۔ وائٹ ہاؤس کے مطابق ٹرمپ نے یہ بیان دے کر خود کو صدر کے عہدے کیلئے نااہل قرار دے دیا ہے۔

مگر ایسا لگتا ہے کہ موصوف کو اپنے وطن کی تاریخ میں زیادہ دل چسپی نہیں ہے۔ اگر وہ امریکی مسلمانوں کی سنہری خدمات سے آگاہ ہوتے تو ہرگز ایسا بیان نہ دیتے، جس کے دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اخبارات، ٹیلی ویژن میں مفت پبلسٹی حاصل کی جائے۔آئے ذرا دیکھیں مسلمانوں نے امریکہ میں کیا خدمات سرانجام دی ہیں کہ وہ اس معاشرے کا اٹوٹ حصہ بن چکے ہیں۔

امریکہ کا قیام

امریکہ کے قیام کے روز اوّل سے ہی مسلمان اس کا حصہ رہے ہیں ۔ برٹش گورنمنٹ کے خلاف امریکہ نے جو جنگ جارج واشنگٹن کی سرکردگی میں لڑی تھی اس میں ایک مسلمان بمپٹ محمد Bampet Muhammad بھی تھا جس نے ورجینیا لائن کیلئے 1775-83 کے دوران جنگ میں عملی طور پر حصہ لیا تھا۔اسی طرح یوسف بن علی جو نارتھ افریقن مسلمان تھا اس نے جنگ میں شرکت کی تھی۔بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ پیٹر بک منسٹر Peter Buckminster بھی مسلمان تھا جس نے وہ توپ چلائی تھی جس سے برطانوی میجر جنرل جان پٹ کئرن John Pitcairn بنکر ہل کی لڑائی میں اس دُنیا سے رُخصت ہوا تھا۔اس کے بعد پیٹر نے بیٹل آف سارا ٹوگا Battle of Saratoga اور بیٹل آف سٹونی پوائنٹ میں حصہ لیا تھا۔امریکن مسلمانوں نے امریکہ کے پہلے صدر کی قیادت میں جنگوں میں حصہ لیا اس کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ اس کی فوج میں مسلمان بھی ہیں۔جارج واشنگٹن یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ محب وطن امریکی ہونے کیلئے یا امریکی فوج میں داخل ہونے کسی کے مذہب یا کسی کی کلچرل بیک گراؤنڈ کا جاننا ضروری نہیں تھا۔یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جب امریکہ نے آزادی کا اعلان کیا تو سب سے پہلے مسلمان ملک مراکش نے اس کو تسلیم کیا تھا۔دونوں ممالک نے 1786ء میں امن اور دوستی کے معاہدے پر دستخط کئے تھے جو کہ امریکہ کی تاریخ میں سب سے طویل ترین معاہدہ ہے جس کو ایک بار بھی نہیں توڑا گیا۔اس موضوع پر تفصیل سے کتاب Thomas Jefferson Quran میں بحث کی گئی ہے۔مسلمان انجنیئر اور ٹرمپ ٹاورز Trump Tower ٹرمپ ٹاور امریکہ کینیڈا کے تمام بڑے شہروں میں تعمیر ہو چکے ہیں۔شکاگو شہر میں موجود ٹرمپ ٹاور شاید وجود میں نہ آ سکتا اگر بنگلہ دیشی فضل الرحمن نے سٹرکچرل انجنیئر نگ میں کمال نہ دکھایا ہوتا۔فضل الرحمن کو Einstein of Structural Engineering کا خطاب دیا گیا ہے۔اس نے ٹیوب فریمز کا سٹرکچرل سسٹم ایجاد کیا جس کی وجہ سے سکائی سکریپرز کی تعمیر آسان ہوگئی۔نیز اس ایجاد کے بعد ہائی رائز بلڈنگوں کی تعمیر میں سٹیل کے استعمال کی ضرورت کم ہوگئی۔ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے دو ٹاور اگرچہ تباہ ہو چکے ہیں مگر ان کی تعمیر فضل الرحمن کی ایجاد سے ممکن ہوئی تھی۔شکاگو کا سیئرز ٹاور SEAR'S اور جان ہین کاک سینٹر John Hancock Centre بھی فضل الرحمن کے مرہون منت ہیں۔سیئرز ٹاور شکاگو کے 108 منزلیں اور 1451 فٹ اونچا ہے۔فضل الرحمن کی وفات 1982ء میں ہوئی تھی مگر اس کی وفات کے بعد تعمیر ہونے والی سکائی سکریپرز اس کی اختراع پسندی کی یادگار ہیں۔جیسے ملواکی کا US Bank Centre، اور منی آپلس میں ہیوبرٹ ہمفری میٹرو ڈوم، ائرفورس اکیڈیمی کولوراڈو۔ان سب کی تعمیر میں فضل الرحمن نے سٹرکچرل انجنیئر کے طور پر کام کیا تھا۔

آٹو پارٹس کا ٹائی کون Tycoon

شاہد خان امیریکن ڈریم کی چلتی پھرتی تصویر ہے۔پاکستان میں پیدا ہونے والا شاہد خان امریکی بلین ائیر اور بزنس ٹائی کون ہے جو 16 سال کی عمر میں یہاں آیا تھا تا کہ یونیورسٹی آف شکاگو میں تعلیم جاری رکھ سکے۔شاہد خان کا کہنا ہے امریکہ پہنچنے کے پہلے روز اس کو $20.1 فی گھنٹہ کے حساب ڈش واشر کے طور ملازمت مل گئی جو کہ پاکستانی سٹینڈرڈ کے حساب سے بہت زیادہ تنخواہ تھی۔ یونیورسٹی میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے آٹو پارٹس کا بزنس شروع کیا جس کا سال کا بزنس اس وقت $9.4 billion ہے۔مئی 2015 میں اس کی نیٹ ورتھ $9.5 billion تھی۔ برطانیہ میں اس کی شہرت اس لئے ہے کہ وہ فٹ بال کی ٹیم Fullham FC کا مالک ہے۔اسی طرح وہ امریکی فٹ بال ٹیم Jaguars Jacksonville کا بھی مالک جو اس $760

million ڈالر میں خریدی تھی۔ کار پارٹس کا بزنس Flex-N-Gate کہلاتا ہے جس کی وجہ سے وہ دنیا کا 360 واں امیر ترین انسان، اور امیر ترین پاکستانی ہے۔ چند سال قبل فوربس Forbes میگزین نے اس کی تصویر اپنے سرورق پر شائع کی تھی۔ اس کے علاوہ مشہور مسلمان امریکن بزنس میں یہ ہیں: محمد الایرین (CEO PIMCO)، فؤاد الحبری (CEO Emergent Solutions)، فاروق کتھواری (CEO Ethan Allen)، عبد المالک مجاہد، پاکستانی امریکن صفی قریشی (CEO AST Research)

آئس کریم کون

آج سے سو سال قبل 1904ء میں سینٹ لوئیس ورلڈ فیئر منعقد ہوا تھا۔ ایک آدمی جو اس موقعہ پر آئس کریم بیچ رہا تھا اس کی ڈشز کم ہوگئیں۔ میلے میں آنیوالے افراد اب آئس کریم کیسے کھائیں گے؟ کیا وہ اپنے ہاتھوں میں آئس کریم ڈال کر ہاتھوں کا چاٹتے رہیں؟ خوش قسمتی سے آئس کریم کی دکان سے اگلی دکان میں شام سے آیا ہوا مہاجر ارنسٹ ہموی کام کر رہا تھا جو وافل کی طرح شیرینی (جلیبی کی شکل کا) زلابیا فروخت کر رہا تھا۔ اس نے وافل کو تکون کی شکل دی اور اس میں آئس کریم ڈال دی۔ یوں دنیا کی پہلی آئس کریم کون دریافت ہوئی جس کو کھایا بھی جا سکتا تھا۔

مریضوں کے مسیحا

امریکہ میں دیکھا گیا ہے کہ اکثر ڈاکٹر ہندوستانی نژاد ہوتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان ڈاکٹر بھی ہزاروں کی تعداد میں امریکہ میں پائے جاتے جن کے بغیر شاید کتنے ہی مریض موت کا نشانہ بن چکے ہوتے۔ کسی امریکی ہسپتال میں چلے جائیں وہاں آپ کو ضرور کوئی نہ کوئی پاکستانی کارڈیالوجسٹ مل جائیگا۔ ایسے ماہر اور کامیاب ڈاکٹروں میں سے ایک ڈاکٹر ایوب امیہ ہے۔ پاکستان میں پیدا ہونے والے اس نیوروسرجن نے 1963ء میں intraventricular catheter system ایجاد کیا جس کے ذریعہ دماغ میں سے پانی اور دیگر مائع نکالے جا سکتے یا کیموتھیراپی کی دوائیاں وہاں پہنچائی جا سکتیں۔ امیہ ریزروائر کے ذریعہ برین ٹیومر کا علاج کیا جاتا۔ امیہ نے سب سے پہلے ٹراوما سکور شروع کیا جس کے ذریعہ traumatic brain injury کو کلاسی فائی کیا جاتا ہے۔ یہ صرف ایک مسلمان ڈاکٹر کی کہانی ہے ورنہ ایسے ہزاروں اور بھی ہیں جو امریکہ میں طبی ایجادات اور دریافتیں کر چکے ہیں۔ شاید کسی روز مسٹر ٹرمپ بیمار پڑ جائیں تو ان کا علاج کوئی مسلمان ہی کرے گا۔

ڈپلومیسی اور سیاست

فرح پانڈتھ، Farah Pandith (ولادت سرینگر کشمیر 1968ء) سابق امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کی ایڈمنسٹریشن میں مڈل ایسٹ انیشا ایٹو کی ڈائریکٹر تھیں، اس کے بعد سٹیٹ ڈی پارٹمنٹ میں یورپ میں مسلمانوں سے مفاہمت کی ایڈوائزر تھیں۔ ہلری کلنٹن کے دور میں وہ مسلمان ممالک کیلئے وہ انوائے تھی۔ کلنٹن کے ذکر میں ہما عابدین کا ذکر بھی ہو جائے۔ مشی گن ریاست کے شہر کالامازو میں پیدا ہونیوالی 39 سالہ ہما عابدین عرصہ سے ہلری کلنٹن کی سٹاف میں شامل رہی ہیں۔ جب ہلری سیکرٹری آف سٹیٹ تھی تو اس وقت ہما ڈپٹی چیف آف سٹاف تھی۔ اس وقت ہما، ہلری کلنٹن کی 2016ء کی امریکی صدر کے انتخاب کیلئے مہم کی ٹیم کی وائس چیئر مین ہے۔ 2012ء میں پانچ ری پبلکن کانگریس ممبرز نے شکایت کی کہ ہما عابدین کے غیر ملکی شدت پسندوں کے ساتھ روابط ہیں۔ تحقیقات کے بعد اس چیز کی شدت سے تردید کی گئی تھی۔ نومبر 2016ء میں ہونے والے انتخابات میں اگر کلنٹن جیت گئیں تو اس میں ہما عابدین کا بہت بڑا ہاتھ ہوگا۔ امریکن کانگریس کا پہلا مسلمان Keith Ellison ہے جو 2006ء میں منتخب ہوا تھا۔ اور ظالمے خالد زاد عراق اور افغانستان میں امریکی سفیر رہ چکا ہے۔

ناانصافی کیلئے لڑائی

امریکہ میں جب غلامی ختم ہوگئی تو بہت سارے افریقن امیرکن بڑی تعداد میں بڑے شہروں کی طرف رخ کرنے لگے۔ مگر شہروں میں رہائشی انتظامات اور ملازمت نہ ہونے کے باعث انہوں نے ghettos میں رہنا شروع کر دیا۔ ان حالات میں بعض افریقن امریکن دانش وروں نے یہ کہنا شروع کیا کہ ہمیں اپنے آباؤ اجداد کے مذہب پر دوبارہ کاربند ہو جانا چاہئے۔ پچاس اور ساٹھ کی دہائی سیاہ فام امریکیوں کو نیشن آف اسلام نے میلکم لٹل (1925–65little) نے اپنی تقاریر سے بہت متاثر کیا جو بعد میں میلکم ایکس کے نام سے مشہور ہوا تھا۔ الحاج ملک الشہباز میلکم نے اپنا نام لٹل Little بدل دیا کیونکہ یہ اس کا غلامی والا نام تھا۔ اس نے نسلیت پسندی کے خلاف علم بلند کیا۔ اس کے مخالف ڈاکٹر مارٹن لوتھر تھا جو سول رائیٹس کے حق میں اشتعال پسندی کے خلاف تھا۔ آج امریکہ میں سیاہ فام میلکم ایکس کے طفیل جملہ حقوق کے حقدار قرار پائے ہیں۔ یہ سب ایک مسلمان کے ذریعہ ہوا تھا جس نے ان کو سیاسی آگہی بخشی کہ اس وقت امریکہ کا صدر ایک سیاہ فام ہے جس کا والد مسلمان تھا۔

سپورٹس ہیروز

امریکی صدر اوباما نے سان برناڈینو کے وحشیانہ قتل کے بعد وائٹ ہاؤس سے اپنی تقریر کے دوران کہا تھا: مسلمان ہمارے سپورٹس ہیروز ہیں۔ اس کے جواب مسٹر ٹرمپ نے کہا تھا اوباما کن ہیروز کی بات کر رہے ہیں؟ چلئے یہ جاننے کیلئے ہم مسٹر ٹرمپ کی مدد کرتے ہیں۔ اس ہیرو کو Luisville lip کہا جاتا ہے، وہ تین بار ورلڈ ہیوی ویٹ باکسنگ چمپئن رہا تھا۔ اس نے 1965 میں اپنا عیسائی نام تبدیل کر کے محمد علی رکھ لیا تھا۔

مسٹر ٹرمپ کیا آپ کو اب یاد آ گیا، یہ وہی محمد علی ہے جس نے آپ کو 2007ء میں محمد علی ایوارڈ دیا تھا۔ مئی 2015ء میں آپ نے محمد علی کے ساتھ اپنی ساتھ فیس بک پر فوٹو لگائی اور کہا یہ میرا دوست تھا۔ اور اب کہتے ہیں مسٹر اوباما کس سپورٹس ہیرو کی بات کرتے ہیں؟ یہاں بات ختم نہیں ہوتی ہم یہاں باسکٹ بال کے چند مزید ہیرو کا نام لئے دیتے ہیں: شکیل اونیل، کریم عبدالجبار، حکیم اللہ جان Hakeem Olajuwon، شریف عبد الرحیم، محمود عبدالرؤوف، مصطفی فراخان، نزر محمد، رشید والس، امریکن فٹ بال کے مشہور کھلاڑی: عیسیٰ عبدالقدوس، امیر عبداللہ، حمزہ عبداللہ، احمد رشاد، روشان سلام، عاقب طالب، اسامہ ینگ، عبدالحاج، افرائم سلام، ظاہر حکیم۔ اور آخر پر سب سے نوجوان باکسر مائیک ٹائی سن جس نے 20 سال کی عمر میں WBA and IBF ,WBC heavyweig کے ٹائیٹل جیتے تھے۔ اس کے علاوہ مشہور امریکی باکسر: برنارڈ ہاپکن، ایڈی مصطفی محمد، میتھیو سعد محمد، ہاشم رحمن، اس ضمن یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ امریکہ کے سپورٹس ٹیلی ویژن ESPN کا ایک سپورسٹس اینکر کینیڈا میں پیدا ہونیوالا عدنان ورک ہے۔

نوبیل انعام یافتہ مسلمان سائنسدان

مصر میں پیدا ہونیوالے پروفیسر احمد ذویل Zewail کو 1999ء میں کیمسٹری میں نوبیل انعام دیا گیا تھا۔ اس کو فادر آف فیمٹو کیمسٹری کا لقب دیا گیا ہے۔ زویل اس وقت کال ٹیک CALTECH میں پروفیسر آف کیمسٹری اور فزکس ہے نیز فزیکل بیالوجی سینٹر کا ڈائریکٹر ہے۔ وہ صدر اوباما کی کونسل آف ایڈاوئزرز آن سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کا ممبر ہے۔ سائنس اور ہیومنٹی کیلئے اس کی سنہری خدمات کے اعتراف میں اس کے اعزاز میں ڈاک ٹکٹ جاری کئے جا چکے ہیں۔

مسلمان کامیڈین

امریکہ میں کامیڈین ہونا ایک با قاعدہ پروفیشن ہے۔ جو لوگ اس پروفیشن میں کامیاب ہو چکے ہیں وہ ملین ائیر بن چکے ہیں۔ ان کے نام کا ہر طرف چرچا ہے۔ وہ دنیا کے دوروں پر جاتے تا وہاں جا کر اپنے شو کر سکیں۔ ایسے کامیاب اور ہنگامہ خیز کامیڈینز میں سے ایک دین عبید اللہ ہے جس کے والد نے فلسطین میں جنم لیا تھا۔ پیشہ کے اعتبار سے دین عبید اللہ وکیل ہے۔ 2005ء میں اس کو کامیڈی ایوارڈ ملا تھا۔ وہ اخبار The Dean Report کا ایڈیٹر اور بانی ہے۔ امریکہ کے بڑے بڑے اخباروں جیسے نیویارک ٹائمز، واشنگٹن پوسٹ، لاس اینجلس ٹائمز، نیوز ویک، ٹائم میں اس کے انٹرویو شائع ہو چکے ہیں نیز امریکہ تمام بڑے ٹیلی ویژن سٹیشنوں پر وہ انٹرویو دے چکا ہے۔ اس نے ایک ڈاکومنٹری بنائی The Muslims Are Coming جس میں مذہب کی آزادی کو موضوع بنایا گیا ہے۔

ایک اور کامیڈین عزیز انصاری ہے جس کی پیدائش ساؤتھ کیرولائنا میں تامل والدین کے یہاں 1983ء میں ہوئی تھی۔ اس کے والد ڈاکٹر ہیں۔ اس کا اپنا ویب سائٹ ہے azizansari.com۔ اور پھر ڈیوشا پیل Dave Chappelle سیاہ فام کامیڈین، ایکٹر، سکرین رائٹر اور پروڈیوسر ہے۔ وہ 1998ء میں حلقہ بگوش اسلام ہوا تھا۔ وہ اپنے مذہب کے بارے میں زیادہ اعلان نہیں کرتا کیونکہ اس کا کہنا ہے کہ میری غلطیوں اور بے راہ رویوں کو کسی کا خوبصورت مذہب اسلام سے منسوب کرنا نازیبا بات ہے۔ اس نے ٹائم میگزین کو 2005ء کے انٹرویو میں کہا تھا Islam is beautiful if you learn it the right way اس کے علاوہ دیگر کامیڈینز کے نام درج کئے جاتے ہیں: احمد احمد، محمد عامر، معاز جبرانی، حسن منہاج، آصف مندوی، اظہر عثمان، میسون زید۔

رائٹرز: پروفیسر رضا اسلان، مونا التہاوی، صلادین احمد، سٹیفن شوارز، مائیکل وولف، فرید زکریا (نیوز ویک ایڈیٹر، CNN اور قلمکار)

ماڈلنگ: سپر ماڈل ایمان (وائف آف David Bowie)، ریما فقیہ (مس یو ایس اے 2010ء)

ٹیلی ویژن: مہمت آز (کارڈیالوجسٹ)، رضوان مانجی، اسعیا مصطفی، کامران پاشا، اقبال تھیبا۔

فلم: شہرے آغداشلو، (ایرانیان ایکٹریس)، مصطفیٰ عقاد، (ڈائریکٹر، پروڈیوسر) لوئیس آرکٹ (ایکٹر، پروڈیوسر)، سید بدریا (ایکٹر)، سعید طغماوی (ایکٹر)۔

میوزک: احمد جمال، احمد ارتگن Ertegun، علی شہید محمد، بگ ڈیڈی کین، ڈی جے خالد، آئس کیوب، یوسف لطیف احمدی، بوسٹن جاز میوزیشن اور ایمی ایوارڈ ونر۔ اس کے علاوہ درجنوں راپر، سنگر، اور گٹارسٹ جیسے زیشان زیدی۔